اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

جنوری ۲۰۲۲ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

پاکستان میں یوں تو بہت سی یونیورسٹیاں ہیں لیکن شاید ہی ان میں سے کوئی ایسی ہو جو اسلامی مقاصد کو پورا کرنے والی ہو، دینی تناظر میں کام کرتی ہو اور ایسی مسلم شخصیت کی تعمیر کرتی ہو جو عصر حاضر میں اسلام کا بہترین نمونہ ہو۔

ڈاکٹر محمد امین نے اس کتابچے میں یہ دکھایا ہے کہ اگر کوئی مطلوبہ یونیورسٹی قائم کرنا چاہے تو اُس کی نوعیت، شکل اور منہج کیا ہوگا۔ اعلیٰ تعلیم پر غور کرنے والوں کے لیے ایک فکر انگیز تصنیف۔

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

ڈاکٹر محمد امین

مکتبہ البرہان لاہور

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل

اسلامی سکول کے خدوخال

تعلیم اور اس کا اسلامی کردار

یکساں قومی نصاب۔ خدشات و مضمرات

تدریس القرآن ① برائے معلمین

تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات

پنج سورہ (اُردو تفہیم)

اسلامی علوم میں تحقیق: اصول، ترجیحات اور معیار

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی

تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک وگائیڈ

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظام تعلیم

نصابِ مدنی

مدرسہ ڈسکورسز۔ مطالعہ وتجزیہ

اصلاحِ دینی مدارس

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟

ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت

خاموش انقلاب۔ ناگزیر ہے

عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)

حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)

اپنی اصلاح آپ کیسے؟

ترکِ رذائل (احمد جاوید)

اسلام اور تعمیر سیرت (زیر طبع)

مغربی فکر وتہذیب

اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش

اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ

اسلام اور ردِّ مغرب

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل

مقالاتِ امین (جلد اوّل)

مقالاتِ امین (جلد دوم)

شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ
البرہان
لاہور

جلد ۲۶، شمارہ ۱، جنوری ۲۰۲۲ء/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ

مشمولات

Oفکر و نظر		
انقلاب و انقلاب و انقلاب	مدیر	۴
Oتعلیم و تربیت		
۔عصر حاضر میں علوم کی اسلامی تشکیل ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی آراء کا محاکمہ	ڈاکٹر محمد امین	۵
۔ دینی مدارس اور جدید علوم	حافظ ابرار حسین	۱۲
Oتزکیۂ نفس		
اپنی اصلاح اور بچوں کی اصلاح و تربیت	احمد جاوید	۱۹
Oتوہینِ رسالت		
۔ سانحۂ سیالکوٹ کی شدید مذمت لیکن....	مدیر	۲۵
۔ کیا توہینِ رسالت کا قانون غیر شرعی ہے؟	مولانا پروفیسر محمد رفیق	۳۳
۔ واقعۂ سیالکوٹ۔حکمرانوں، لبرلز اور متجددین کا غلط رویہ	سید خالد جامعی	۴۳
۔ پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی۔ اسباب و علاج	مدیر	۴۶
Oپاکستانیات		
پاکستان کی معاشی تباہی ۔حل موجود ہے	ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری	۵۳
Oخود نوشت		
مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا؟ (۷)	مدیر	۶۱
Oافغانستان		
اسلامی افغانستان ۔ زوال پذیر مغربی تہذیب کا مدفن	حافظ ابرار حسین	۶۳
Oمطالعۂ کتاب		
'دروسِ سرمایہ داری' از ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری	امین اشعر	۷۵
Oاشاریہ البرھان		
البرہان ۲۰۲۱ء ایک نظر میں	ادارہ	۷۹

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ عمران رضا طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 70 روپے
سالانہ 800 روپے۔ پانچ سال: 4000 روپے
تاحیات 15,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
15 شیر شاہ بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

انقلاب و انقلاب و انقلاب

مسلمانوں کا اصل روگ مغرب کی فکری غلامی ہے۔ مسلمانو! اٹھو اور غلامی کے اس جوئے کو اتار پھینکو
پاکستان میں عمران خان نیازی جیسے حکمران مغرب کی سیاسی و معاشی غلامی اور جاوید غامدی جیسے
سکالر مذہبی شعبے میں فکری غلامی کا سمبل ہیں۔ یہ ہز ماسٹرز وائس اور بھونپو ہیں

البرہان میں فکری مضامین اندر کے صفحات میں ہوتے ہیں، پہلے صفحے کا زوردار اداریہ جذباتی طور پر جھنجھوڑنے اور مسائل کی نشاندہی کے لیے ہوتا ہے۔

ملک معاشی طور پر تباہی کے دہانے پر ہے۔ مہنگائی عروج پر ہے اور عوام بھوکے مر رہے ہیں۔ کیا وسائل کی کمی ہے؟ کیا پاکستان معاشی طور پر خود کفیل نہیں ہوسکتا؟ اتنا قرض کس نے لیا اور وہ کہاں گیا؟ ہم کہتے ہیں کہ مغرب نے پلاننگ اور سازشوں سے پاکستان جیسے ملکوں کو اس حال تک پہنچایا ہے۔ کیا ہم لوگ عقل نہیں رکھتے؟ حکمران فوجی ہوں یا سیاسی، سب مغرب کے غلام ہیں۔ وہ مغرب کی معاشی غلامی کا جوا اُتار کر پھینک سکتے ہیں بشرطیکہ انہیں اس غلامی کا احساس ہو جائے۔ اور ان میں اتنی جرأت پیدا ہو جائے۔ یہ عملاً ممکن ہے اور پاکستان معاشی تباہی سے بچ سکتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کا مضمون اندر کے صفحات میں موجود ہے۔

سانحۂ سیالکوٹ پر جاوید غامدی صاحب کا یہ بیانیہ کہ ’توہین رسالت کا قانون قرآن، حدیث اور فقہ میں ہے ہی نہیں‘ دینی فکر میں مغرب کی غلامی اور تجدد کا شاہکار ہے۔ مذہبی انتہا پسندی کے الزام کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بعض علماء کا سری لنکن سفارت خانے جانا، معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا اور ان کا شرع اسلامی میں نبی کریم ﷺ کے عطا کردہ اس استثنیٰ کا انکار کرنا کہ اگر کوئی مسلمان غیرت وحمیت کی بناء پر شاتم رسول کو قتل کردے اور عدالت اس نتیجے پر پہنچے کہ اس قتل کی وجہ سبّ وشتم رسول ہی تھا تو اس کا خون ہدر ہوگا، مغرب سے مرعوبیت اور مغرب کے دباؤ ہی کا نتیجہ ہے۔ پاکستان کی دینی قوتیں مسلسل غیر مؤثر اور ناکام ہو رہی ہیں۔ أليس منكم رجل رشيد جو سوچے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے اور اس کا حل کیا ہے؟ بلکہ حل تو ہم مسلسل کئی برسوں سے پیش کر رہے ہیں لیکن کوئی سوچنے والا ہی نہیں!

تعلیم و تربیت　　ڈاکٹر محمد امین

عصرِ حاضر میں علوم کی اسلامی تشکیلِ نو

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی آراء کا محاکمہ

۱۔ یہ بحث اگرچہ نئی نہیں پرانی ہے تاہم ادارہ معارف اسلامی کراچی نے اپنے جریدے پندرہ روزہ 'معارف فیچر'[۱] (جلد ۱۴، شمارہ ۲۲، یکم دسمبر ۲۰۲۱ء) میں ڈاکٹر محمد رفعت کا وہ مضمون شائع کیا ہے[۲] جو ماہنامہ 'زندگی نو' دہلی (شمارہ ستمبر ۲۰۱۴ء) میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے اس موضوع پر ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کے مضمون Islamization of Knowledge, Reflections on Priorities یعنی 'علوم کی اسلامی تدوین۔ترجیحات کا جائزہ' مطبوعہ American Journal of Islamic Social Sciences (جلد ۲۸ شمارہ ۳، ۲۰۱۱ء)[۳] پر تبصرہ کیا تھا اور اس میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کی آراء کا تجزیہ کرتے ہوئے (اور مولانا مودودیؒ کی فکر سے استفادے کا تاثر دیتے ہوئے) ڈاکٹر صدیقی صاحب کی آراء ہی کی بالواسطہ تصویب کی ہے۔'معارف فیچر' نے یہ مضمون طبع کر کے گویا پاکستانی قارئین کے لیے اس بحث کو تازہ کر دیا ہے چنانچہ ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ اس بحث میں حصہ لے کر اس موضوع پر صحیح نقطۂ نظر واضح کریں اور مذکورہ ڈاکٹر صاحبان کے مغربی فکر سے متاثر مؤقف کا محاکمہ کریں۔

یاد رہے کہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کا اندازِ فکر بڑی حد تک متجددانہ اور مغربی فکر سے مرعوبیت پر مبنی ہے۔ہم نے اپنی مرتبہ کتاب 'اسلامی علوم میں تحقیق: اصول، ترجیحات اور معیار' میں اُس موضوع پر ان کے خیالات قارئین کے سامنے رکھتے ہوئے اس تاثر کا بھی اظہار کیا تھا۔یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ مولانا مودودیؒ ان کے فکری اسلوب کو ناپسند کرتے تھے۔ڈاکٹر

---

[۱] یہ ایک مفید اور معلوماتی جریدہ ہے جس میں اکثر اسلام، پاکستان اور عالم اسلام کے حوالے سے غیر مسلم اور غیر پاکستانی مفکرین و مصنفین کے مضامین کا اُردو ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔

[۲] آن لائن مطالعہ کے لیے دیکھیے: www.irak.pk

[۳] آن لائن مطالعہ کے لیے دیکھیے: www.ajiss.org

رفعت صاحب نے بھی دھیمے اور نرم انداز میں انہی کی لے کو آگے بڑھایا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر رفعت صاحب ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے مقالے کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں علوم کی اسلامی تدوین کے سلسلے میں پیش کیے گئے تصورات اور اس سمت میں کی جانے والی عملی کوششوں کا جائزہ لیا ہے، خصوصاً مولانا مودودیؒ کی تحریروں اور ڈاکٹر اسماعیل فاروقی مرحوم کے پیش کردہ خاکے پر گفتگو کی ہے۔اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر صدیقی صاحب کے مقالے کے اہم نکات کی تلخیص دی ہے جو درج ذیل ہے:

الف۔ علوم کی اسلامی تدوین پر گفتگو کرتے ہوئے دو طرح کے کاموں میں فرق کیا جانا چاہیے، اگرچہ دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ان میں سے ایک کام موجود علمی سرمائے کا مفید استعمال ہے۔ یہاں اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ معلومات کا استعمال اخلاقی قدروں کے تابع اور اخلاقی حدود کا پابند ہو۔اس کام کے کرنے کے لیے اخلاقی اقدار کا شعور اور انسانی زندگی سے ان کے ربط کی دریافت وشناخت ضروری ہے۔اس کام سے جداگانہ مستقل حیثیت رکھنے والا دوسرا کام یہ ہے کہ موجود علمی سرمائے میں اضافہ کیا جائے ،نئی معلومات فراہم کی جائیں اور تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر علم کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔اس کام کو انجام دینے کے لیے آزاد فضا درکار ہے، جہاں دماغوں اور ذہنوں کو سوچنے کی اور نئی راہیں تلاش کرنے کی آزادی ہو۔

ب۔ مندرجہ بالا دونوں کاموں کی اہمیت مسلّم ہونے کے باوجود ان میں سے موخر الذکر کام زیادہ ترجیح کا مستحق ہے۔لیکن محسوس ہوتا ہے کہ علوم کی اسلامی تدوین کے مجوزین اور داعیان ابھی تک تحقیقی کام کو وہ اہمیت نہیں دے سکے ہیں، جو اسے ملنی چاہیے تھی۔

ج۔ علم کے دائرے کو وسیع کرنے کا کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے آفاقی ہے، یعنی اس کام کی انجام دہی میں انسانیت کے مختلف گروہوں کا باہمی تعاون ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔دین اور عقیدے کا اختلاف یا اخلاقی نقطۂ نظر کا اختلاف اس تعاون میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

د۔ علم کو حصولِ قیادت یا حصولِ اقتدار کا ذریعہ سمجھنا محلِ نظر ہے۔علم کا یہ تصور منفی رویوں کو جنم دیتا ہے۔

ہ۔ یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ انسان کی صلاحیت محدود ہے، وہ سب کچھ نہیں جان سکتا اور انسانی علم کا ہر جزو یکساں قطعیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔انسانی معلومات کا ایک بڑا حصہ ظنّی ہوتا

ہے اور اس میں ابہام پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قطعیت کا دعویٰ کرنے کی بجائے علم کی جستجو کرنے والوں کے لیے انکسار کا رویہ زیادہ مناسب ہے۔

و۔ یہ سوال سنجیدہ غور کا مستحق ہے کہ کیا مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ دنیا کی امامت کریں، اس پر غلبہ حاصل کریں اور دنیا کا نقشہ اسلام کے مطابق بدلیں؟

ز۔ ضرورت ایک ایسے علم کی دریافت کی ہے جو وقت کے ساتھ بدلتی ضرورتوں کو پورا کر سکے، جس کا مفید استعمال کیا جائے اور جو روحانی اساس پر استوار اخلاقی نقطۂ نظر کی رہنمائی سے فیض یاب ہو۔

۳۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کے افکار کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے۔

اسلامی غلبے کے تصور کی نفی

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ''یہ سوال سنجیدہ غور وفکر کا مستحق ہے کہ کیا مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ دنیا کی امامت کریں، اس پر غلبہ حاصل کریں اور دنیا کا نقشہ اسلام کے مطابق بدلیں'' اور یہ بھی کہ ''علم کو حصولِ قیادت یا حصولِ اقتدار کا ذریعہ سمجھنا محل نظر ہے۔ علم کا یہ تصور منفی رویوں کو جنم دیتا ہے۔''

اسلام کے ہدایت نہ ہونے، اس کے دنیا کی قیادت نہ کرنے اور اس کے غلبے کے تصور سے دست برداری کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ مغربی ممالک کا، مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کا اور اس کا فر تہذیب کی روشنی میں پروان چڑھے علوم کا موجودہ غلبہ قبول اور تسلیم کیا جائے۔ مغرب کی فکری اور عملی غلامی کا درس دینے والے یہ 'دانشور' سرسید اور غلام احمد قادیانی سے لے کر عصر حاضر میں بھارت کے مولانا وحید الدین خاں اور پاکستان کے جاوید احمد غامدی تک، سب یہی چاہتے ہیں کہ مسلمان مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ قبول کر لیں۔ اسی لیے وہ اسلام کی کتر بیونت کر کے اس کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو اسے مغربی فکر وتہذیب کے مطابق دکھائے لیکن جمہور علماء اور جمہور امت ان مغرب زدہ نابغوں کی تاویلات قبول کرنے کو تیار نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ذریعے اسلام کا غلبہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم تھی اور اللہ تعالیٰ اسے قیامت تک کے انسانوں کے لیے ماڈل اور

مثال بنانا چاہتا تھا۔ اسلام اور کفر کی کشمکش ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو کفر اور اس کی تہذیب کو اختیار کرے اور چاہے تو اسلام اور اس کی تہذیب کو لیکن بعض انسان منافقت پر اتر آتے ہیں، نام اسلام کا لیتے ہیں لیکن غلبہ کفر اور اس کی تہذیب کا چاہتے ہیں۔ اللہ نے اپنی آخری کتاب میں واضح کر دیا ہے کہ وہ یہ دھوکہ نہ اللہ کو دیتے ہیں اور نہ مسلمانوں کو بلکہ اپنے آپ ہی کو دیتے ہیں اور اللہ نے انہیں ان کے انجام سے بھی خبردار کر دیا ہے لیکن وہ سمجھتے نہیں کیونکہ وہ شعور نہیں رکھتے۔

'آزادی' کا تصور

ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ ''دوسرا کام یہ ہے کہ موجود علمی سرمائے میں اضافہ کیا جائے، نئی معلومات فراہم کی جائیں اور تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر علم کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے 'آزاد' فضا درکار ہے، جہاں دماغوں اور ذہنوں کو سوچنے کی اور نئی راہیں تلاش کرنے کی 'آزادی' ہو۔''

سوال یہ ہے کہ یہاں 'علم' سے کون سا علم مراد ہے جس کے لیے ڈاکٹر صاحب کو 'سوچنے کی اور نئی راہیں تلاش کرنے کی آزادی' درکار ہے اور تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر علم کے دائرے کو وسیع کرنے، موجودہ علمی سرمائے میں اضافہ کرنے اور نئی معلومات فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

یاد رہے کہ اسلام میں علوم کی اقسام درج ذیل ہیں:

علومِ نقلیہ: قرآن وسنت جو حتمی، مقدس اور ناقابل تغیر ہیں۔

علومِ عقلیہ: ان کی تین اقسام ہیں:

- علومِ آلیہ: جو علومِ نقلیہ کی تفہیم، ڈویلپمنٹ اور ان کے اطلاق میں معاون ہوتے ہیں۔ جیسے عربی زبان، علمِ تفسیر، علمِ جَرح وتعدیل وعلمِ اسماء الرجال وغیرہ۔
- عمرانی وسماجی علوم: جیسے اقتصادیات، سیاسیات، تعلیم وغیرہ

ان کا نصف علومِ نقلیہ پر مشتمل ہوتا ہے جو ناقابلِ تغیر اور ان علوم کی بنیاد ہوتا ہے اور باقی پچاس فیصد کا تعلق انسانی عقل، تجربے اور ضرورت سے ہوتا ہے، جو قابل تغیر ہوتا ہے بلکہ اسے

لازماً تبدیل ہوتے رہنا چاہیے تاکہ وہ عصری اور مقامی ضروریات پوری کرنے کا اہل ہو سکے۔

علوم آلیہ اور اور سماجی علوم میں عقل کا استعمال اسلامی روایت میں 'اجتہاد' کہلاتا ہے۔ اجتہاد اسلام میں مادر پدر آزاد فکری سرگرمی کا یا غیر اسلامی افکار اور غیر اسلامی تہذیبوں کی اندھی نقالی کا نام نہیں ہے بلکہ لازم ہے کہ اجتہاد علوم نقلیہ کے خلاف نہ ہو، ان کے اصول و مقاصد سے ہم آہنگ ہو اور ان سے مستنبط ہو۔ استنباط کی یہ شرط اتنی اہم ہے کہ اسلاف کے ہاں 'اجتہاد' کا نام ہی 'قیاس' پڑ گیا تھا اور اسے بھی وہ انفرادی علمی سرگرمی کی بجائے اجتماعی علمی سرگرمی کی شکل دینا پسند کرتے تھے جسے اجتماعی اجتہاد یا 'اجماع' کہا جاتا تھا۔ کیونکہ انفرادی اجتہاد میں غلطی کا امکان زیادہ ہوتا ہے جب کہ مجتہدین کا اتفاق رائے اسے بڑی حد تک یقینی بنا دیتا ہے۔

پھر اجتہاد میں اہلیت کی شرط بہت اہم ہے۔ ہر آدمی مجتہد نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو عربی زبان پر عبور ہو، قرآن وسنت میں مہارت ہو اور دیگر اسلامی علوم کے عربی مآخذ تک اس کی رسائی ہو خصوصاً وہ فقہ واصولِ فقہ میں دسترس رکھتا ہو اور اس میں استنباط کا ملکہ بھی موجود ہو۔ پھر اس کا متقی ہونا اور اخلاقی عیوب سے پاک ہونا بھی ضروری ہے تاکہ مسلم عوام اس کے علم وعمل پر اعتماد کر سکیں۔ آج کل کے بیشتر سکالرز اور دانشوروں میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں لہٰذا وہ اجتہاد کے اہل ہی نہیں ہیں۔

سائنسی علوم: جیسے ریاضی، صنعت وحرفت، سائنس وٹیکنالوجی اور زراعت وغیرہ۔ یہ عقلی وتجربی علوم ہیں جو براہ راست وحی کا دائرہ کار نہیں ہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے کھجوروں کے پیوند والے معاملے میں فرمایا تھا[1] لیکن اس کے باوجود ضروری ہے کہ ان کا اسلوب اور ان کے نتائج علومِ نقلیہ اور ان کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوں اور ان کے حصول میں معاون ہوں اور بہر قیمت ان کے خلاف یا ان سے متضاد نہ ہوں۔

اسلامی فلسفۂ علم میں 'آزادی' کا تصور

اسلامی فلسفۂ علم میں تصور آزادی کے تین پہلو ہیں:

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۳۶۳

ایک یہ کہ اسلام میں اجتہاد مادر پدر آزاد علمی وفکری سرگرمی کا نام نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ علوم نقلیہ سے ہم آہنگ ہو، ان سے مستنبط ہو، ان کے مقاصد کو پورا کرنے والا ہو اور کسی قیمت پر ان کے خلاف نہ ہو اور نہ ان کے مقاصد کی نفی کرنے والا ہو، جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں وضاحت سے بتایا ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ کسی غیر اسلامی، کافر اور الحادی فکر وتہذیب کی اندھی نقالی پر مبنی نہ ہو کیونکہ اس صورت میں بھی اجتہاد یا اسلام میں فکری وعلمی سرگرمی نہ آزاد تصور ہوگی اور نہ اسلامی شریعت سے ہم آہنگ۔ کسی تہذیب کے بنیادی نظریات (عقائد) اگر غیر اسلامی ہوں، وحی اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کے خلاف ہوں تو ان نظریات سے بننے والا ورلڈ ویو لازماً غیر اسلامی ہوگا اور اس ورلڈ ویو پر مبنی فلسفۂ علم اور اس سے پھوٹنے والے علوم لازماً اسلام کی تعلیمات وعلوم سے مختلف اور ان سے متضاد ہوں گے اور آخری نتیجے میں مسلمانوں کے لیے مضر اور ناقابلِ قبول ہوں گے۔

آج سے دوصدیاں پیشتر مسلمان یورپی اقوام کے محکوم ہو گئے، اپنی آزاد حیثیت اور آزاد فکر کھو بیٹھے۔ ایسے میں اس امر کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ بعض یا اکثر مسلم مفکرین اور مصلحین غالب فکر وتہذیب سے مرعوب ہو جائیں۔ خواہ وہ غیر اسلامی ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ملفوظاتِ اقبال میں ہے کہ علامہ اقبال نے ایک دفعہ فرمایا کہ مَیں اس کا انکار نہیں کرتا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو الہام نہیں ہوتا ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ اس الہام کا منبع کیا ہے؟ غلامی اور فکری افلاس؟ تو میں اس الہام کا کیا کروں؟ انہوں نے یہ بات اپنے اشعار میں بھی کہی ہے ؎

وہ نبوّت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قُوّت و شوکت کا پیام

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سِکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

چنانچہ علامہ کا کہنا ہے کہ ایسے میں ضرورت آزاد فکری اور اس کے مطابق تقدم کی نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ غالب یہ ہے کہ فکری وعملی غلامی کی صورت میں نکلے گا بلکہ ضرورت ماضی کی طرف رجوع اور اپنے فکری ودینی مآخذ سے جڑ جانے اور ان کی تقلید کرنے میں ہے۔ یہاں یہ اعتراض اور بہانہ

نہیں چلے گا کہ تہذیبی سفر Air Tight Compartments میں نہیں ہوتا بلکہ تہذیبیں زندگی کے سفر میں ہمیشہ ایک دوسرے سے استفادہ کرتی ہیں لہٰذا اسلامی فکر وتہذیب مغربی فکر وتہذیب سے استفادہ کیوں نہیں کر سکتی؟ دیکھیے ہم اس اصول کا انکار نہیں کرتے لیکن ماضی کا تجربہ اور عقل عام اس کے لیے تین شرطیں تجویز کرتی ہے:

ایک یہ کہ استفادہ کرنے والی تہذیب آزاد اور خودمختار ہو جیسے مسلم تہذیب نے یونانی فکر وتہذیب کو رد کر دیا لیکن اس سے محدود استفادہ بھی کیا۔

دوسرے یہ کہ استفادہ کرنے والی تہذیب دوسری تہذیب سے جب کوئی چیز لیتی ہے تو اسے آنکھیں بند کر کے بعینہٖ نہیں لے لیتی بلکہ اسے پہلے اپنے ماحول اور اپنی ضروریات کے مطابق تبدیل کرتی ہے۔ اس میں کانٹ چھانٹ، کمی بیشی کر کے اسے اپنے ماحول سے Tailor کرتی ہے مثلاً حضرت عمرؓ نے ایرانی تہذیب سے انتظامی اور مالی پیکیج لیا (جسے 'دیوان' کہا جاتا ہے) تو اسے اپنی ضرورت اور حالات کے مطابق Tailor کیا مثلاً بدری صحابہ کا وظیفہ عام صحابہ سے زیادہ رکھا۔ فوجی ملازمین کی چھٹیوں کا مسئلہ پیش آیا تو آپ اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس گئے اور کہا کہ بیٹا شرعی مسئلہ ہے اس لیے شرم کو اس میں حارج نہیں ہونا چاہیے، یہ بتاؤ کہ ایک عورت کتنا عرصہ اپنے خاوند سے دور رہ سکتی ہے کہ اس کے اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑے۔ حضرت حفصہؓ نے کہا چھ ماہ تک۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حکم جاری کر دیا کہ ہر فوجی ملازم کو چھ ماہ بعد لازماً چھٹی دی جائے کہ وہ اپنے اہل وعیال کے پاس جائے۔ خلاصہ یہ کہ دوسری تہذیب سے اگر کچھ لینا ہو تو وہ ایسی چیز نہ ہو جو بہت Value Loaded ہو اور پھر اسے لے کر اپنی فکر وتہذیب کے مطابق اسے تبدیل کیا جائے تا کہ وہ اس کے لیے قابلِ ہضم بن سکے۔

تیسری بات جو یاد رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ علم کبھی بلا اقدار (Value Neutral) نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ عالم اور مفکر کا علم اور اس کی شخصیت (جس فکری وعلمی ماحول میں وہ پروان چڑھی ہو) اس کے علمی نظریات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ بات اگر ہم کہتے تو شاید مغربی فکر سے متاثر حضرات اسے تسلیم نہ کرتے لیکن یہ بات تو خود مغرب کے مفکرین کہہ رہے ہیں، کارل پاپر اور کوہن کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا کسی مسلمان مفکر اور مصلح کو اس اصول سے کبھی صَرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے اور دوسری فکر وتہذیب سے استفادے کے وقت اسے سامنے رکھنا چاہیے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۸)

تعلیم و تربیت حافظ ابرار حسین

دینی مدارس اور جدید علوم

دینی مدارس کی تعلیمی روایت (درس نظامی) اور جدید علوم کا باہمی تعلق ممکنہ طور پر کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہونا چاہئے؟ مجھے یہ سوال اٹھانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ بلا تفریق مسلک تمام دینی مدارس میں جدید علوم جن مروجہ خطوط پر پڑھائے جا رہے ہیں یا پڑھانے کی تیاری ہو رہی ہے وہ دینی اور علمی دونوں حوالوں سے محل نظر ہیں۔ اس سوال کی جوابی تفصیلات میں جانے سے پہلے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس سوال کی اہمیت کو سمجھ لیں۔ گزارش ہے کہ گذشتہ دو اڑھائی صدیوں سے مسلم تہذیب کو غیر معمولی صورتحال درپیش ہے۔ غیر معمولی صورتحال غیر معمولی سوالات کو جنم دیتی ہے۔ یہ سوال بھی کئی زاویوں سے بہت ہی اہم اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلم دینی معاشرت اور تہذیب کو اس کے اصول و مظاہر کی سطح پر زندہ رہنا ہے تو اس سوال کا فوری، قطعی اور واضح جواب تلاش کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ مزید جتنا عرصہ ہم اس سوال کو معطل رکھیں گے یا ٹالتے رہیں گے اسی حساب سے ہماری ملی اور تہذیبی بقاء مخدوش سے مخدوش تر ہوتی چلی جائے گی۔ دینی علم کے حاملین ہی ہدایت کی شرائط پر ہماری ملی اور تہذیبی بقاء و نمو کے لیے آخری امید ہیں۔ ہمارے جدید افراد سے اس نوع کی توقع کرنا تہذیبی خود کشی کے مترادف ہے۔ علما کو فوری طور پر یہ ادراک کرنا چاہئے کہ نظری سطح پر جدید علوم کی ہدایت کے ساتھ نسبتوں کی معیاری تفہیم پیدا کریں۔ علم کی معروف شرائط پر ہدایت کے مقتضیات کو بیان میں لائیں۔ یہ تبھی ممکن ہوگا جب علما جدید علوم میں نظری سطح پر رسوخ پیدا کریں گے جس کے لئے مدارس میں اس علوم کی تدریس موثر طریقے سے کی جانی چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سوال ہمارے لیے نہ تو نیا ہے اور نہ ہی غیر مانوس۔ جدیدیت کے زائیدہ علوم سے ہمیں اسی وقت سے واسطہ ہے جب سے یورپی استعمار نے مسلم دنیا میں پنجے گاڑے ہیں۔ ہم جدید یورپ کی سیاسی، معاشی اور عسکری طاقت کا نشانہ پہلے بنے اور جدید علوم سے اس کے بعد واقف ہوئے۔ جدید علوم کے مقابل مسلم ردعمل کو سمجھنے کے لیے یہ ترتیب ملحوظ رہنی چاہیے۔ برصغیر میں جدید علوم کی طرف مسلم ردعمل اب تک دو صورتوں میں ظاہر ہوا ہے؛ مرعوبیت

اور انکار۔سرسید احمد خان اور ان کی معنوی اولاد مطلقاً مرعوبیت کا شکار رہی ہے جبکہ دینی علما ان کا انکار کرتے چلے آئے ہیں۔اسے دینی ذہن کی خوبی کہیے یا عذر کہ یہ ہر نئی چیز کو لازماً شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔جب تک کسی چیز کی ہدایت کے ساتھ نسبت واضح نہ ہو، دینی شعور اس کے رد و قبول میں متردد رہتا ہے۔میں اسے دینی شعور کی خوبی سمجھتا ہوں۔دینداری کے تحفظ و بقا کی ضمانت اسی رویے میں مضمر ہے۔یہ ہدایت کے ساتھ وابستگی کا بنیادی اصول اور لازمی پیرایہ ہے لیکن دین کی علمی روایت کے حاملین کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اس اصول کی بنیاد پر واقعیت کا انکار کرنے لگیں یا محض تحکم کا مظاہرہ کریں۔علما کے ردعمل کے برعکس سرسید اور ان کے متبعین کا کام تو بس اتنا ہے کہ دین کو جدیدیت کی کارگاہ میں خام مال کی طرح صَرف کردیں اور پھر دین کی ''پیداواری صلاحیت'' پر بغلیں بجائیں۔علما جب تک جدید علوم کے چیلنج کا سامنا نہیں کرتے تجدد پرست اسی طرح بغلیں بجانا جاری رکھیں گے۔ہمیں پہلے ہی قدم پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس سوال کی نوعیت اختیاری نہیں جبری ہے۔خواہی نخواہی ہمیں اس سوال کا سامنا کرنا ہے۔جدید دنیا اپنے اجمال و تفصیل میں جدید علوم ہی کی رہین منت ہے۔اس کے افکار و احوال، حالات، وواقعات اور ترک و اختیار جدید علوم کے پیدا کردہ ہیں۔جدید دنیا اب کسی مخصوص جغرافیہ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عالمگیر صورت حال بن چکی ہے۔یہ جدید علوم ہی کی نتیجہ خیزی ہے۔ہم چاہیں یا نہ چاہیں ہمیں جدید علوم کی ہدایت کے ساتھ نسبتوں کا تعین کرنا ہے جس کے لئے معروف شرائط پر تفصیلی علمی بیان تا حال درکار ہے۔

ہمارے جدید تعلیمی اداروں کا نصاب، طریق تعلیم اور امتحانی نظام اپنے اجمال اور تفصیل میں مکمل طور پر نوآبادیاتی ہے۔ان اداروں نے علم اور تعلیم کی پچھلی سات دہائیوں میں جو ''خدمت'' سرانجام دی ہے میں یہاں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔مختصراً عرض ہے کہ یہ ادارے مکھی پہ مکھی مارتے چلے جا رہے ہیں۔تعلیم و تعلم کی سطح اتنی پست ہے کہ سوچ کر ہی کراہت ہوتی ہے۔علم کی تشکیل ان کا مقصد ہی نہیں ہے۔میں خود ان اداروں میں پڑھا ہوں اور تیرہ سال سے ہائر کلاسز کو پڑھاتا بھی ہوں۔مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ان اداروں کے اساتذہ کا علمی قد کاٹھ کیا ہوتا ہے اور طالب علم طلبِ علم میں کتنے سنجیدہ ہوتے ہیں۔ان کے لیے پیرویٔ مغرب میں تعلیم معاشی سرگرمی ہے۔یہاں تعلیم پانے والے ۹۹ فیصد طلبا و طالبات کو نہ تو ڈھنگ سے کوئی زبان آتی ہے نہ ہی کوئی علم۔ویسے بھی تعلیم عامہ کا تصور ظاہر ہے کہ اصلاً سرمایہ داروں کو ہی

سازگار ہے۔ تعلیم عامہ سرمایہ داری کے کارندے پیدا کرنے کا بندوبست ہے۔ یہ نام نہاد جدید تعلیمی ادارے صرف ہمارے بچوں کا وقت ہی ضائع نہیں کر رہے بلکہ ان کی معیشت بھی برباد کر رہے ہیں۔ جدید تعلیم پانے والے جدید علوم کے مالہ وماعلیہ کو معمولی درجے میں بھی نہیں جانتے۔ ایسی صورتحال میں کیا ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ جدید علوم کو تنقیدی نظر سے دیکھ سکیں گے اور مسلم تہذیب کو دورِ جدید میں مطلوب فکری وسائل فراہم کر پائیں گے؟ آپ اس پر غور کیجیے کہ ریاست پاکستان سات دہائیوں میں کئی سو کھرب روپے جدید تعلیم پر صرف کر چکی ہے لیکن حاصل کیا ہے؟ لارڈ میکالے کے الفاظ میں کلرکوں کی فوج ظفر موج! انہوں نے کون سی ایجادات کی ہیں؟ کون سے نئے علمی تناظرات قائم کئے ہیں؟ کون سی بڑی علمی پیش رفت کی ہے؟ یہاں بیشتر سوشل سائنسز پڑھنے والے کلرک (بھلے وہ dignified کلرک ہی ہوں) جب کہ ہارڈ سائنسز پڑھنے والے ٹیکنیشن بنتے ہیں۔ جدید تعلیمی اداروں کے کارپرداز اِن اداروں کی عملی ناکامی ونامرادی کی وجہ وسائل کی کمی وغیرہ بتاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کی بات ٹھیک ہو لیکن اصل وجہ یہ نہیں ہے۔ اصل وجہ اس نظام کی تعمیر میں مضمر خرابی۔ ان کے نصاب اور طریق تدریس اس لائق ہی نہیں ہیں کہ یہ کوئی بڑے علمی نتائج پیدا کر سکیں۔ نہ علم، نہ ہنر، نہ نظر، نہ بصیرت، نہ اخلاق، نہ کردار۔ مغربی طرز کی اس تعلیم نے آدابِ غلامی سکھانے اور انسان کے اندر بہیمیت کو ابھارنے کے سوا ہمارے کون سے علمی واخلاقی مقاصد کی آبیاری کی ہے؟

اس سب پر مستزاد امتحانی نظام ہے۔ میری رائے میں یہ امتحانی نظام انسانی شخصیت کا قتل اور ذہانت کی بربادی ہے۔ یہ صرف یادداشت کا امتحان ہے۔ اس نے طالب علم کے ارادۂ تعلم کو ہمیشہ کے لیے معطل کر دیا ہے۔ اسی کی بدولت نصاب بے ربط معلومات کا پلندہ بن کر رہ گیا ہے۔ علم کچھ ملکات کا نام ہے نہ کہ الل ٹپ معلومات کو رٹ لینے کا۔ میں نے جدید تعلیمی اداروں سے متعلق جو باتیں عرض کی ہیں یہ اب بدیہیات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان اداروں کے کارندے خوب جانتے ہیں کہ میری باتیں حرف بحرف مبنی بر حقیقت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں نے یہ باتیں ان کو نیچا دکھانے کے لیے نہیں کیں بلکہ احساسِ ذمہ داری سے مسئلے کی نشاندہی کرنے کی غرض سے کی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو غلطی جدید تعلیمی اداروں میں کی جارہی ہیں وہ جدید علوم کے حوالے سے مدارس میں نہ دہرائی جائے۔

بدقسمتی سے دینی مدارس کے نصاب میں جدید علوم کا دخل اسی پیٹرن پر ہوا ہے جس پیٹرن پر یہ علوم جدید اداروں میں پڑھائے جا رہے ہیں چند ایک مدارس نے تو تین چار دہائیوں سے اپنے ہاں جدید سوشل سائنسز کے کچھ مضامین کی تعلیم کا اجراء کر لیا تھا۔ تاہم مجموعی طور پر مدارس میں جدید علوم کا دخل غالباً ۲۰۰۵ کے بعد ہوا ہے۔ کئی ایک مدارس میں طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا ہے کہ درس نظامی کے طلباء کو میٹرک اور انٹر وغیرہ کے مروجہ کورسز پڑھا دیے جائیں۔ بعض طلباء پرائیویٹ بی اے اور ایم اے کے امتحانات بھی پاس کر لیتے ہیں۔ کچھ فاضلین بی اے اور عالیہ کی سند کی بنیاد پر ایم فل اور پی ایچ ڈی تک چلے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جدید علوم کا مروجہ نصاب اور امتحانی نظام کیا نتائج پیدا کر رہا ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ ابھی تک اس کا حاصل وصول موہوم معاشی سکیورٹی سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ میں جدید تعلیمی اداروں پر بات کرتے ہوئے عرض کر چکا ہوں کہ ان کا نصاب، طریق تعلیم اور امتحانی نظام بالکل بوگس ہے۔ اہل مدارس نے درس نظامی کے استناد کے لیے جدید امتحانی نظام کو بالکلیہ اختیار کر کے دین کی علمی روایت کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ یہ اعتماد کا فقدان ہے یا جانے کیا کہ جو نظام خود قابل اصلاح بلکہ قابل تنسیخ ہے اس کی نقالی کی جائے۔ درس نظامی کی تعلیمی روایت طلباء میں علوم وفنون میں واقعی مہارت پیدا کرنے سے دلچسپی رکھتی ہے۔ اب اگر سند وغیرہ ضروری ہے تو اس کے لیے ایسے امتحانی طریقے متعارف کروائے جائیں جو دینی تعلیم کے مقاصد سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اصول تعلیم، نصاب، طریق تعلیم، اسلوب تعلم، مقاصد تعلیم اور امتحانی نظام آپس میں اصولی طور پر متعلق ہیں۔ پھر تصور تعلیم اور تصور انسان میں تطابق ہوتا ہے۔ درس نظامی کے لیے جدید امتحانی نظام کو اختیار کرنا دینی مدارس کی قیادتوں کی بصارت اور بصیرت، دونوں پر سوالیہ نشان ہے۔ تعلیمی عمل خلا میں وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ اس کے مبادی ومقاصد کا ایک تہذیبی تناظر ہوتا ہے۔ جدید اسالیب وشرائط کے ساتھ روایتی دینی تعلیم کے التزام نے شترگربگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مروجہ طریقے پر جدید علوم پڑھانے اور جدید امتحانی نظام اختیار کرنے کے دینی مدارس پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ ہم آئندہ سطور میں لیں گے۔

میں سابقہ سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ امتحانی نظام کے ساتھ ساتھ بالعموم دینی مدارس میں پچھلے کچھ عرصے سے جدید علوم کا دخل اسی طرز پر ہوا ہے جس طرز پر یہ علوم جدید اداروں میں پڑھائے جا رہے ہیں۔ اب مجھے ان کے اثرات پر بات کرنی ہے۔ دینی حلقوں میں یہ عام مشاہدہ

ہے کہ جدید نظام امتحان کی وجہ سے درسی نظامی کا تعلیمی معیار بری طرح مجروح ہوا ہے۔طلباء میں علوم وفنون کی تحصیل کی بجائے محض ڈگری لینے کے رجحانات پروان چڑھے ہیں۔میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ بعض طلباء کسی مدرسے میں پڑھے بغیر صرف خلاصوں کی مدد سے درس نظامی کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرجاتے ہیں۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طالب علم مدرسے میں دوسرے یا تیسرے سال میں زیر تعلیم ہوتا ہے جبکہ امتحان چوتھے یا پانچویں سال کے دے رہا ہوتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ درس نظامی کی سند لینے کے لیے باقاعدہ طور پر درس نظامی پڑھنا ضروری نہیں رہا۔سوال یہ ہے کہ کیا دینی مدارس کے وفاق وتنظیمات اس صورتحال سے لاعلم ہیں؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔انہیں اس صورتحال کا علم ہے۔اسے کیا کہا جائے کہ سب جانتے بوجھتے ہوئے وہ اس کا مداوا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔یہ دین کی علمی روایت کا خاتمہ کرنے کے مترادف ہے جسے ظلم عظیم کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔دین کی تعلیم اپنی نوعیت میں ہر تعلیم سے مختلف ہے۔یہاں حکم کا درست فہم عمل کی بنیاد ہے۔حکم کے درست فہم کے لیے علمی استعداد درکار ہے۔جدید امتحانی نظام علمی استعداد کی راہ میں رکاوٹ ہے۔دینی مدارس کی قیادتوں پر لازم ہے کہ مسئلے کی سنگینی کا ادراک کریں اور امتحان کے متبادل طریقے وضع کریں جو دینی مقاصد تعلیم سے مطابقت رکھتے ہوں۔

مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دینی مدارس میں جدید علوم کی تعلیم ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ہمارے کلاسیکی معقولی علوم یعنی طبیعیات،عنصریات،فلکیات اور العلم العالی یعنی فلسفہ وغیرہ بیشتر متروک ہو چکے ہیں۔ریاضیات،ہندسہ اور منطق میں بھی بہت کچھ پیشرفت ہوچکی ہے۔ہم طلبا کو متروک علمیت وذہانت کی تحصیل کروا کے معاصر دنیا سے ان کی لاتعلقی کا سبب بن رہے ہیں۔گویا ہم انہیں ایک ایسی زبان سکھا رہے ہیں جسے طاق نسیاں کی زینت بنے زمانے گزر چکے ہیں۔یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہمارا علم الکلام جن عقلی وعلمی تصورات کے ردعمل میں پیدا ہوا تھا اب وہ تصورات ماضی کی یادگار ہیں۔میری بات کا ہرگز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میں روایتی معقول پڑھانے کی نفی کررہا ہوں۔میں دینی علم کے حامل کسی بھی شخص سے زیادہ اس بات کا قائل ہوں کہ ان علوم کو درس نظامی کے نصاب میں باقی رکھنا چاہیے۔بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ وفاق وتنظیمات نے جن کتابوں کو نصاب سے بے دخل کیا ہے انہیں دوبارہ داخل

نصاب کرنا چاہیے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ علم کی تاریخ پڑھے بغیر علم پر خلاّ قانہ دسترس کا ادنی امکان بھی باقی نہیں رہتا۔اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ معقولات کے متون وحواشی اور شروحات میں ضمناً ایسا بہت کچھ وقیع مواد ہے جسے نظر انداز کرنا علم سے دست بردار ہونے کے مترادف ہے۔

جہاں تک مدارس میں جدید علوم کی تدریس کا تعلق ہے تو گزارش ہے کہ میٹرک، انٹر اور گریجوایشن، ماسٹر وغیرہ کے امتحانات پاس کرنے کی غرض سے طلباء کو جدید علوم میں ضروری دسترس حاصل ہوجائے گی۔یہاں دو باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔پہلی بات کا تعلق اس امر سے ہے کہ وہ کون سے جدید علوم ہیں جن کی تعلیم درس نظامی کے طلباء کو دی جانی چاہیے؟ دوسری بات یہ ہے کہ ان علوم کی تعلیم کے لیے کیا طریق تدریس اختیار کیا جائے؟ پہلی بات پر میری رائے یہ ہے کہ سائنسز اور سوشل سائنسز میں سے بنیادی نوعیت کے مضامین مثلاً فزکس، ریاضیات، جیومیٹری، کمپیوٹر سائنس، جدید منطق وفلسفہ، سیاسیات، سماجیات، نفسیات، لسانیات، فلسفہ تاریخ، جدید اصولِ قانون اور مابعد نوآبادیاتی مطالعات کے معیاری متون داخل نصاب کیے جانے چاہئیں۔میبذی کی ابتدائی ابحاث میں علوم کی اقسام کی وجہ حصر بیان ہوئی ہے۔وہاں یہ کہا گیا ہے کہ حقائق اپنے وجود کے تحقق میں ارادے کے تابع ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔جو حقائق ارادے کی طرف محتاج نہیں ہیں وہ وجود ذہنی اور خارجی میں مطلقاً ملحق بالمادہ نہ ہوں تو العلم العالی کا موضوع ہیں۔اگر دونوں مادے کے محتاج ہوں تو طبیعیات کا موضوع اور صرف وجود خارجی میں مادے سے ملحق ہوں تو ریاضیات کا موضوع بنتے ہیں۔لیکن وہ حقائق جو وجود پذیری میں ارادے کے تابع ہوتے ہیں مثلاً علمِ اخلاق، تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدن کا موضوع بننے والے حقائق؛ ہمیں ان کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شارع نے ہمیں ان سے بے نیاز کردیا ہے۔گزارش ہے کہ مسلمان جب یونان کے عقلی علوم سے واقف ہوئے تھے تو اس تعارف کی نوعیت دوطرح سے مختلف تھی۔اولاً: یونانی علوم کی نوعیت نظری تھی یعنی ان علوم کا مقصدِ اولین علمِ وجود تھا نہ کہ ایجادِ وجود۔جدید علوم اپنے میتھڈ میں استقرائی اور مقاصد میں Pragmatic ہیں۔ثانیاً: یونانی علوم اس وقت کسی زندہ تہذیب سے متعلق نہیں تھے بلکہ تقریباً متروک ہو چکے تھے۔مسلمانوں نے سکندریہ سے ان علوم کو لیا اور ان کا احیاء کرنے کا بیڑہ اٹھالیا۔احیاء کے اس عمل میں مسلمانوں کو تاریخ ساز کامیابی حاصل ہوئی۔آج تاریخِ علوم کا ہر بڑا آدمی یہ تسلیم کرتا ہے

کہ قرون وسطی میں یورپ نے یونانی علوم کو عرب مسلمانوں سے اخذ کیا۔ جدید علوم کا معاملہ قطعی طور پر مختلف ہے۔ ایک تو ان علوم کی نوعیت محض نظری نہیں بلکہ عملی ہے۔ دوسرے یہ کہ جدید دنیا اپنے اصول وفروع میں انہی علوم کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ جدید دنیا فطرت کے مقابل عالمگیر سطح پر ایسا مصنوعی بندوبست ہے جس نے انسان کے انفس وآفاق کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا اب ہمارے لیے نہ کوئی جائے فرار ہے نہ مقامِ قرار۔ ہمیں مثلِ خلیل جدید علوم کی آگ میں کود کر اس نار کو گلزار کرنا ہے۔ سائنسز ہوں یا سوشل سائنسز ہمیں ہر اہم نوعِ علم میں مہارت درکار ہے۔ ان علوم میں یہ مہارت انہیں ہدایت کی مرادات پر ڈھالنے کے لیے ناگزیر ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ طریقِ تدریس کیا ہونا چاہیے؟ تو ہمارا روایتی طریقِ تدریس جدید پیڈا گوجی کی نسبت غیر معمولی حد تک موثر اور نتیجہ خیز ہے۔ اس طریقِ تدریس میں اگر ثانوی نوعیت کی کچھ ناگزیر تبدیلیاں کرنی پڑیں تو اس میں حرج نہیں ہے۔ امتحانی طریق کار پر میں پہلے بات کر چکا ہوں۔ میں نے جو گزارشات کی ہیں ان کی روشنی میں ہم نے خود ایک نصاب مرتب کیا ہے جسے جلد شائع کر دیا جائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بقیہ: عصرِ حاضر میں علوم کی اسلامی تشکیلِ نو

اس بات کو علومِ نقلیہ کی تفہیم وتفسیر، علوم آلیہ اور عمرانی وسماجی علوم میں تو پیشِ نظر رکھنا ہی چاہیے، ہم کہتے ہیں کہ علومِ عقلیہ محضہ میں بھی اسے سامنے رکھنا چاہیے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ زریں میں سائنس وٹیکنالوجی میں جو پیش رفت کی (اور اُس ماحول کے مطابق وہ خاصی تخلیقی اور اہم تھی) وہ اسلامی تعلیمات اور مقاصد سے ہم آہنگ تھی اور اس نے کبھی اسلامی طرزِ زندگی کو زک نہیں پہنچائی؛ لیکن مغربی فکر وتہذیب نے سائنس وٹیکنالوجی میں جو پیش رفت کی ہے اس نے ایٹم بم، میزائل، کیمیائی ہتھیاروں اور پلوشن کی صورت میں سارے عالم کے لیے سیکورٹی کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اس نے مثلاً 'تصویر' کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ آج موبائل اور پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا نے مسلم معاشروں کو اور ان کی اخلاقی اقدار اور معاشرتی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لیے خالص عقلی علوم کا بھی اسلامی فکر وتہذیب سے ہم آہنگ ہونا لازمی ہے۔ (جاری ہے)

تزکیۂ نفس

احمد جاوید

اپنی اصلاح اور بچوں کی اصلاح وتربیت

یوں لگتا ہے کہ جدیدیت نے اپنے مختلف اداروں کے ذریعے عالم گیر سطح پر کچھ بنیادی تبدیلیاں پیدا کردی ہیں، دنیا میں بھی اور انسان میں بھی۔یعنی دنیا کے بارے میں بنیادی تصورات بدل چکے ہیں اور تصورِ انسان میں بھی ایسی جوہری تبدیلیاں داخل ہوگئی ہیں جن کے اثر سے شعور اور اخلاق کی بناوٹ ہی وہ نہ رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔انسان اور تہذیب چلانے والے اصول بدل جائیں تو اس تبدیلی کا اثر اس ذہن اور مزاج پر بھی پڑتا ہے جو اس تبدیلی کا مخالف ہے۔بالفاظِ دیگر لادینیت اگر انسانی نفسیات اور تہذیب کے مرکز میں اپنی جگہ بنالے اور اندر باہر کی دنیا کا نظام چلانے والی قوت کی حیثیت اختیار کرلے تو اس کی بنائی ہوئی فضا میں سانس لینے کا اثر اُن لوگوں پر بھی مرتب ہوتا ہے جو اس فضا میں رہنا نہیں چاہتے اور اس کے مخالف ہیں۔مذہبی ذہن کے ساتھ یہی المیہ ہوا ہے کہ یہ اپنے بس بھر جدیدیت سے دوری یا لڑائی کی حالت میں رہتا ہے لیکن اس کی بنائی ہوئی دنیا میں رہنے پر مجبور ہے۔اسے بدلنے کی نیت تو رکھتا ہے لیکن اس کوشش کو جن صلاحیتوں اور وسائل کی ضرورت ہے وہ جدیدیت سے ٹکراؤ رکھنے والی مذہبی طاقتوں میں سردست مفقود ہیں۔جدیدیت اپنے مخالفوں پر کس طرح اثرانداز ہوتی ہے، اس اثراندازی کے بہت سے مظاہر ہیں لیکن اپنے موضوع کی رعایت سے اس مجلس میں ہم ایک دو پہلوؤں تک محدود رہیں گے۔

ہم اگر خود کو دھوکہ نہ دینا چاہیں تو یہ بات ہم پر پوری طرح واضح ہونی چاہیے کہ ہمارے مجموعی مزاج کی تشکیل میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کا وہ حتمی کردار کہیں نظر نہیں آتا جس سے خالی رہ کر اسلام اور بندگی کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔نہ ہم نے کبھی اپنے ذہن کو بنانے کے لیے قرآن کو سیکھا سکھایا ہے، نہ کبھی اپنے اخلاق، دل اور طبیعت کی تعمیر کے لیے رسول اللہ ﷺ کی محبت کو اپنا امام بنایا ہے۔انسان کی سب سے بڑی طاقتیں یہی دو ہوتی ہیں کہ اس کا ذہن کتنے بڑے خیالات اور علوم پیدا کرسکتا ہے اور اس کا مزاج، اس کا اخلاق کتنی بڑی

معاشرت اور انسانیت کو جنم دے سکتا ہے۔ علم ضروری ہے دنیا کو سنوارنے کے لیے اور اخلاق ضروری ہے انسانیت کو بنانے کے لیے۔ یہ دو انتہائی بنیادی چیزیں ہیں جو ہم نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اخذ نہیں کیں۔ یہ بات کسی آدمی کی رائے اور قیاس وغیرہ کی نہیں ہے۔ ہمارا دین ہم پر واجب کرتا ہے کہ ہم اپنی بہترین صلاحیتوں کو اس سے اخذ کریں۔ اپنے ذہن کو قرآنی ورلڈ ویو پر رکھیں اور اپنی طبیعت کو اس اخلاقی گداز پر قائم کریں جس کا بہترین نمونہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت مبارکہ اور اخلاق مطہرہ ہیں۔ اس کو نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ذہن اور طبیعت کی پسماندگی اور کمتری کی وجہ سے ہم غیروں کے محتاج بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم اللہ سے، اس کے رسول ﷺ سے اور اسلام سے علانیہ اظہار بیزاری کرنے والوں کے دست نگر، محتاج اور فقیر بن کے رہ گئے ہیں۔ کوئی اسلامی ملک، کوئی اسلامی ریاست اور کوئی اسلامی معاشرہ ایسا نہیں ہے جو تعلیم سے لے کر دفاع تک اور معیشت سے لے کر دواؤں تک دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے دنیا کو کھنگالنے والے اور دنیا پر غالب آنے والے ذہن کی تعمیر کتاب اللہ سے نہیں کی، اور انسانوں کے لیے پُرکشش ماڈل بننے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اپنا کر کوئی کردار پیدا نہیں کیا۔ نہ ہم کوئی مکمل آدمی بنانے میں کامیاب ہیں، نہ پورا عالم اسلام کوئی مثالی معاشرہ بنانے میں کامیاب ہے اور نہ کوئی مثالی ریاست بنانے میں ہم بارہ سو سال سے کامیاب ہیں۔

اور زوال کسے کہتے ہیں؟ تم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک productive individual، ایک مثالی فرد نہ تیار کر سکو، تم دنیا کے سماجی نظام میں کوئی نمونہ بننے کے لائق معاشرہ نہ بنا سکو، تم اپنے دین پر قائم ہو جانے والی کوئی ریاست نہ بنا سکو، اور زوال کسے کہتے ہیں؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بے وفائی کا مکمل ترین مظاہرہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ مَیں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اپنے اندر سے بھی، نعوذ باللہ، نکال رکھا ہے، اپنی معاشرت سے بھی خارج کر رکھا ہے، اپنے نظام پر بھی بے اثر کر رکھا ہے، مزید کسی جگہ تو میں موجود ہی نہیں ہوں۔ میں وہ بدنصیب ہوں کہ جہاں جہاں ہوں، وہاں وہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو فراموش رکھتا ہوں اور فراموش کروانے کا سامان رکھتا ہوں اور پھر اوپر سے دعوے کرتا ہوں کہ فلاں نظام لاؤں گا، فلاں قانون بناؤں گا، فلاں آئین بناؤں گا۔ الفاظ کی سختی اور لہجے کی درشتی پر

معافی چاہتا ہوں لیکن کیا کیا جائے، ہم جس بگاڑ میں دیدہ دانستہ مبتلا ہیں اس سے نکلنے کا پہلا قدم ہی یہ ہوگا کہ ہم خود پر ملامت کریں، سختی کے ساتھ، مضبوط کے ساتھ۔ اپنی موجودہ حالت سے نفرت کئے بغیر ہم ان اقدار سے مناسبت نہیں پیدا کر سکتے جن پر اللہ ہمیں ثابت قدم دیکھنا چاہتا ہے، صادق الاحوالی کے ساتھ، اخلاق ذہن کے ساتھ، مجاہدانہ طبیعت کے ساتھ! سچی بات یہ ہے کہ ہم خود سے پیچھا چھڑائے بغیر خود کو کبھی نہیں پا سکتے۔ ہم نے انسانی شخصیت کے اسفل حصے کو پوری آمادگی کے ساتھ قبول کر کے اسے اپنا مکمل تشخص بنا رکھا ہے۔ یہ ہمیں گھٹیا پن اور بے اصولی کی ایسی دلدل میں دھنسا رہا ہے جو قیام کے قابل چھوڑتی ہے نہ سجدے کے لائق رکھتی ہے۔ اس میں دھنسنے والے کی سانس جاری رہتی ہے اور اس کی بندگی کا دم گھٹ جاتا ہے۔ ہم بے وفائی کی لپیٹ میں خود آئے ہیں، کسی نے ہمیں اس میں دھکیلا تھوڑی ہے۔ ہم نے اسے اپنا طرزِ زندگی بنایا ہے، اپنا طرزِ معاشرت بنایا ہے، اپنا طرزِ تربیت بنایا ہے۔ ہم اپنی اولاد کو قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوری طرح بچاتے ہیں۔ آپ میں سے کتنوں کے گھروں میں میٹرک کے طالب علم کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مقدسہ کے بڑے بڑے واقعات یاد ہیں؟ کسی لڑکے سے میں پوچھوں کہ احد پہلے ہوئی تھی یا خندق پہلے ہوئی تھی تو وہ گڑبڑا جائے گا۔ آپ حساب اور انگریزی پڑھانے کے لیے تیس چالیس ہزار روپے کا آدمی ڈھونڈتے ہیں اور قرآن پڑھانے کے لیے پانچ سو روپے کے بیچارے مفلوک الحاق قاری صاحب، جو آپ کا عیش و آرام دیکھ کر پہلے ہی آپ کی بندگی میں جا چکے ہیں۔ کوئی آدمی ایسا ہے جس نے اپنے بچے کے لیے معلم قرآن ڈھونڈنے میں اتنی تگ و دو کی ہو جتنا اسے حساب اور کیمسٹری پڑھوانے کے لیے کی؟

قرآن یہ ورلڈ ویو دیتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کے لیے مدد فراہم کرتے رہو۔ آپس میں ایک دوسرے کو دینی، دنیاوی کسی بھی اعتبار سے گرنے نہ دو۔ آپس میں شفقت اور خیرخواہی پر مبنی معاشرت پیدا کر کے حق کا جھنڈا اٹھالو تو تم ہی غالب رہو گے۔ جو لوگ اللہ کے نام پر اور محبت کی بنیاد پر ایک نظام اخوت بنا لیتے ہیں، وہی پھر اللہ کی طرف دعوت کو کفر کی شکست کا سبب بناتے ہیں۔ تربیت یہ ہے کہ اپنے میں مواخات پیدا کرو، اس کے بعد ظلم اور ضلالت کے تمام ستونوں کو گرا دینے والی قوت تمہیں خود بخود حاصل ہو جائے گی۔ ہم نے اس ترتیب کو الٹ رکھا ہے۔ الٹ کہاں رکھا ہے، کوئی ایک جز بھی اختیار نہیں کیا ہوا۔ ہمارے یہاں

حق کا غلبہ ایڈونچرازم ہے اور آپس میں خیر خواہی ایک تحزب کے تحت ہے، اور وہ بھی ایسی ہی ہوتی ہے جیسی سٹاک ایکسچینج کے کارکنوں میں ہوتی ہے۔ وہ انسانی محبت تھوڑی ہے! انسانی محبت ہو تو میرا باپ بیمار ہے، مجھے تم تبلیغ کے لیے نکالنے کیوں آئے ہو؟ انسانی محبت ہو گی تو یہ فکریں بھی ساتھ ہوں گی ناں! مجھے چار مہینے سے نوکری نہیں ملی، تم مجھے مسلسل سامع بنائے ہوئے ہو ایک ایسے نصاب کا جو میرے کسی کام نہیں آ رہا۔ رسول اکرم ﷺ ضرورت کو دیکھتے تھے، ضرورت کے درجے کو نہیں دیکھا کرتے تھے۔ ایک ضرورت ہے مجھے پنکھے کی، دوسری ضرورت ہے مجھے جنت میں محل کی۔ اب ظاہر ہے دونوں ضرورتیں ہیں۔ کوئی آدمی کہے کہ چھوڑو پنکھے کو، بس جنت کا راستہ ٹھیک ہے اور وہ میں تمہیں بتا رہا ہوں، آؤ میرے ساتھ۔ یہ کون ہے؟ یہ آدمی تو آدمی کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوا۔ رسول اکرم ﷺ ضرورت کی شدت کو بھی دیکھتے تھے، صرف فضلیت کو نہیں دیکھتے تھے۔ بھوک لگی ہے تو جماعت چھوڑ دو، بچے کے رونے کی آواز آئے تو نماز مختصر کر دو، یہ معاشرت کہاں ہے؟ یہی وہ معاشرت ہے جو دوسرے کو گرنے نہیں دیتی، نہ دنیاوی اعتبار سے، نہ اخلاقی اعتبار سے اور نہ دینی اعتبار سے۔ اور ایک دوسرے کو گرنے نہ دینے والی قوت کو ہمارے ہاں مواخات کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اور آپ بھائی بن کر ایک دوسرے کی حفاظت کریں گے تو اس حفاظت میں شدت اور تاثیر زیادہ ہوگی، کرائے کے فوجیوں کی طرح ملک کی سرحد بچانے والوں کے مقابلے میں تنخواہ دار Mercenaries کے مقابلے میں۔ اب ہمارے سارے ادارے فنا ہو چکے ہیں اور خاندان کا ادارہ فنا ہونے پر تلا ہوا ہے۔

جو میں کہنا چاہ رہا تھا وہ یہ ہے کہ آج سے خدا کے لیے یہ شروع کرو کہ بچے کا مادۂ علم، بچے کے دماغ میں حرکت کا نظام قرآن سے مانوس کر کے بناؤ۔ قرآن میں بیان شدہ کائنات کو پرنکس اور آئن سٹائن کی کائنات سے بہت بڑی ہے۔ اس سے سائنسی ذہن کی تسکین بھی زیادہ ہو جائے گی۔ قرآن میں بتائی ہوئی ہر بات انسانی دنیا اور انسانی ادراک سے نکلی ہوئی سب باتوں سے سائز میں بھی بہت بڑی ہے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ بچے کے سر پر قرآن کو کفیلِ شعور اور کفیلِ وجود نہیں بنایا۔ بچے کی ذہنی دنیا اور سوچنے سمجھنے کا انداز، تین برس کی عمر سے قرآن کے سائے میں رکھ کر بناؤ تا کہ گیارہ بارہ، چودہ برس کی عمر تک آتے آتے تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ قرآن کے معارف، قرآن کے قرب، قرآن کے ورلڈ ویو سے بننے والا ذہن عام لوگوں کے مقابلے میں کتنا

بالاتر ہوتا ہے، کتنا مکمل ہوتا ہے، کتنا یقین پر کھڑا ہوا ہوتا ہے اور کتنا خودرائی سے پاک ہوتا ہے اور یہی عمر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی اولاد کا ایسا محبوب بناؤ کہ وہ کہہ سکیں ''بابا! آپ بھی کچھ نہیں ہیں، رسول اللہ ﷺ کی محبت کے آگے'۔ تم سوچو ناں! بندگی کس چیز کا نام ہے؟ ذہن خدا کے مرکز کے گرد گھومے، قلب اللہ کو محبوب بنا کر عاشقوں کی طرح اس کی طرف لپکتا رہے۔ بچے تو بعد میں آتے ہیں پہلے اپنے آپ کو تو اِدھر لائیں۔ آج سے تہیہ کرلیں کہ قرآن شریف کو اپنے دماغ کی، اپنے علم کی سب سے قیمتی بلکہ واحد متاع بنانا ہے، تنہا بنیاد بنانا ہے۔ آج سے طے کرلیں کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت اور اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا واحد جوہر بنانا ہے۔ کیا جاتا ہے؟ تم اللہ کے سپرد ہو رہے ہو، کسی اناڑی ماسٹر کے پاس تھوڑی جا رہے ہو جو کہتا ہے کہ سات برس سے پہلے یہ کورس پڑھایا ہی نہیں جاسکتا۔

قرآن شریف کی تلاوت سے گھر گونجنا چاہیے۔ وہ گھر مقبرہ ہے اور مقبرہ بھی فرعون کا ہے، جہاں قرآن کی آواز نہیں گونجتی۔ روز سب بچوں کے ساتھ سیرت کی نشست کیا کریں۔ اہتمام سے رسول اکرم ﷺ کی سیرت واقعات کی شکل میں پڑھیں۔ ایک دن پڑھیں، دوسرے دن بچوں کا امتحان لیں اور عمل کا بھی لیں۔ بچے پر کبھی کمپرومائز نہ کیجئے گا۔ اس میں حیا ہونی بہت ضروری ہے، بڑوں کا ادب ہونا ضروری ہے اور سخاوت بہت ضروری ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت اقدس سے مانوس ہونے کے ساتھ ہی حاصل ہونے والے جو سب سے پہلے نتائج ہیں، وہ یہی ہوتے ہیں۔ تمہارا بچہ حیادار بن جائے گا، سخی بن جائے گا، سچا بن جائے گا، بڑوں کا ادب کرنے والا بن جائے گا۔ اور حیا کو خاص طور پر اہمیت دیجیے گا۔ بخل پیدا ہو جائے تو وہ چھوڑا جاسکتا ہے، بڑوں سے تھوڑا بہت اونچ نیچ ہو جائے تو شرمندہ ہوا جاسکتا ہے۔ کوئی ایک آدھ جھوٹ بول دیا جائے تو اس سے بھی نجات پائی جاسکتی ہے لیکن بے حیائی پیدا ہو جائے تو اس کا علاج بہت مشکل ہے۔ بے حیائی تمام گناہوں کی ماں ہے۔ بے حیائی کہتے کسے ہیں؟ نہ اللہ سے شرمانا نہ بندے سے شرمانا۔ جس سے اللہ کی شرم اٹھ جائے اسے کیا فرق کہ وہ اللہ کے دین پر چلے۔ حیا بہت ضروری ہے اور اس میں لڑکی لڑکے میں تمیز نہ کریں۔ یہ جاہلیت ہے کہ لڑکی بے پردہ نکلی تو طوفان مچ گیا اور لڑکا رسالے میں ایکٹریس کی تصویر دیکھ رہا ہے تو اسے کوئی نہیں ٹوکے گا۔ یہ دین دار لوگوں کا نظامِ تربیت بتا رہا ہوں آپ کو! اس طرح کی مجلسیں بنائیں، اس طرح کے لوگ

ڈھونڈیں جو قرآن شریف کے ساتھ اسلاف کے طریقے پر مناسبت پیدا کریں۔ جس طرح ہمارے سلف قرآن شریف سے تعلق رکھتے تھے، اس طرزِ تعلق پر کوئی شخص اگر آپ کو مجھے قرآن شریف سے نزدیک آنے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے تو وہ ہمارا سب سے بڑا مرشد ہے، وہ ہمارا سب سے بڑا استاد ہے، وہ ہمارا سب سے بڑا محسن ہے۔ لیکن جدید آدمیوں کی طرح نہیں، ان کا مقصود محض ریسرچ ہے۔ اللہ نے ہمیں اس وقت جس امتحان میں ڈالا ہے، وہ یہ ہے کہ "یہ یا ہم؟" یہ یاد رکھنا! ہم سخت امتحان کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں اور اس وقت اللہ سوال یہ کر رہا ہے کہ یہ یا ہم؟ اس میں اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا اور کوئی ڈھیل نہیں ملے گی، اب صاف جواب دینا ہے اور جواب کیا دینا ہے، اُس کو کون جواب دے گا؟ صاف صاف عرض کرنا ہے کہ یا اللہ آپ کے سوا کون ہے میرا! یہ عمل سے، جذبے سے، ذہن سے، سب سے ثابت کرنا ہے، ورنہ ڈھونڈتے رہو گے کہ میزائل بنالیں گے تو ترقی کرلیں گے، جی ڈی پی بڑھالیں گے تو زوال سے بچ جائیں گے۔

سکندرِ اعظم کی سلطنت اس کے آخری سانس کے ساتھ ٹوٹ گئی تھی کہ اللہ بڑے سے بڑے اسٹرکچر کو اس طرح ڈھادیتا ہے۔ کسی وہم میں نہ رہنا کہ میرا گھر ادھورا رہ جائے گا، میرا کاروبار متاثر ہوگا۔ ارے کاروبار کیا، وہ ساری دنیا کو ایک لمحے میں غارت کرسکتا ہے۔ اللہ کو مشتعل کردینے والا بہانہ نہ بناؤ۔ ہاں یہ کہو یا اللہ! کمزور ہوں، یا اللہ! رحم فرما، یا اللہ! کمزور ہوں بہانے نہیں بنا رہا، یا اللہ! طاقت بھی دے دیجیے، کمزوریاں معاف کردیجیے، بے وفا نہیں ہوں، نافرمان نہیں ہوں، باغی نہیں ہوں! ('اصلاحی باتیں')

OIC اور حکومت پاکستان کی کارکردگی؟

حکومت پاکستان نے نہ افغانستان کی حکومت تسلیم کرنے کا معاملہ اٹھایا، نہ فنڈ ریزنگ کی، نہ امریکہ کی مذمت کی کہ وہ افغانوں کے پیسے دبا کر انہیں بھوکا مار رہا ہے، تو اس نے اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کانفرنس سے کیا حاصل کیا؟ سوائے ایک کاغذی قرارداد منظور کرانے کے کہ افغانوں کی مدد کے لیے ایک ٹرسٹ بنایا جائے گا۔ گویا نشستند و گفتند و خوردند و برخواستند۔

توہینِ رسالت ڈاکٹر محمد امین

سانحۂ سیالکوٹ کی شدید مذمت لیکن....

اور یہ 'لیکن' بہت بڑا ہے اور اس سے کئی بہت سنجیدہ اور گھمبیر مسائل جڑے ہوئے ہیں

* توہین رسالت میں کمزور مؤقف رکھنے والے مغرب زدہ علماء اللہ کا خوف کریں

ہم سانحۂ سیالکوٹ کی شدید مذمت کرتے ہیں جس میں بظاہر توہین رسالت کے نام پر ایک غیر مسلم غیر پاکستانی شہری کو ہجوم نے تشدد کر کے ہلاک کر دیا اور جلا دیا۔ اس سے بلاشبہ پاکستان کی بدنامی ہوئی اور پاکستان میں جس طرح کا 'اسلام' ہے اس اسلام کی بھی بدنامی ہوئی لہٰذا عدالتی کاروائی کے بعد مجرموں کو سخت ترین سزائیں دی جانی چاہئیں لیکن....

اور یہ 'لیکن' بہت بڑا ہے اور اس سے بہت سے سنجیدہ اور گھمبیر مسائل جڑے ہوئے ہیں۔ ہم اہل علم وفکر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ جذباتیت سے ہٹ کر سنجیدگی اور بردباری سے ان مسائل پر غور فرمائیں جن کی طرف ہم ان کی توجہ مبذول کرا رہے ہیں:

۱۔ پاکستان میں مذہب کے نام پر تشدد کا رجحان کیوں بڑھ رہا ہے؟ کیا اس کے ذمہ دار علماء اور دینی جماعتیں ہیں؟ اور اس بات میں کتنا وزن ہے کہ پاکستان میں بعض 'حکمران طبقات' (حکمران طبقات، جنہیں بعض لوگ اسٹیبلشمنٹ اور اشرافیہ بھی کہتے ہیں، کے چار بڑے عناصر ہیں: ۱۔ فوج ۲ سیاستدان ۳۔ بیوروکریسی اور ۴۔ عدلیہ) ان متشدد مذہبی لوگوں کی در پردہ حمایت کرتے ہیں؟

ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ بلاشبہ پاکستان میں بعض مذہبی عناصر جذباتیت کو ہوا دے رہے ہیں اور ہماری رائے میں یہ بھی صحیح ہے کہ حکمران طبقات میں سے بعض ان کی در پردہ حمایت کرتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس مظہر (Phenomenon) کے پسِ پشت کون سے اسباب وعوامل کارفرما ہیں؟

ہماری رائے میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ پاکستان کے حکمران طبقات نے پہلے دن سے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ پاکستان کو ایک ایسی صحیح اسلامی ریاست نہیں بننے دیں گے جس میں اقتدار

کی قوت فرد اور معاشرے کو سچا اور باعمل مسلمان بنانے پر صرف ہو[۱] لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی عوام جذباتی مسلمان ہیں اور ملک میں ایسی جینوئن مذہبی قوتیں موجود تھیں جو اسلامی کاز کے لیے انہیں متحرک کر سکتی تھیں لہٰذا حکمران طبقات نے اسلام اور اسلامی قوتوں کو براہ راست رڈ اور چیلنج کرنے کی بجائے مداہنت اور منافقت کا راستہ اپنایا۔ آئین اور قوانین میں اسلام کو کاغذی طور پر باقی رکھا لیکن عملاً نافذ نہیں کیا اور نہیں ہونے دیا[۲]۔ پھر مذہبی جماعتوں کو آپس میں لڑایا اور عوام میں ان کی اس طرح ہوا خیزی کی کہ وہ سیاسی طور پر ہی ناکام نہیں ہوئیں فکری، تعلیمی، معاشرتی، معاشی ہر لحاظ سے ناکام ہو گئیں اور حکمران طبقات و سیکولر سیاسی جماعتوں کے لیے خطرہ نہ رہیں۔ ظاہر ہے جب آپ مولانا مودودیؒ، مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا شاہ احمد نورانیؒ جیسے مدبر علماء کو سیاست میں ناکام بنائیں گے تو پھر مولانا خادم حسین رضوی جیسے لوگ ہی ابھر کر سامنے آئیں گے۔

یہ تصویر کا ایک پہلو تھا، دوسرا پہلو یہ ہے کہ امریکہ جیسے ماڈرن، طاقتور، جمہوری اور 'مہذب' (؟) ملک میں بھی حکمران سیاسی جماعتوں کا جتنا کردار ہے، پینٹا گون اور سی آئی اے کا کردار ان سے کم نہیں ہے۔ تو پاکستان جیسے ملک میں اگر فوج اور خفیہ ایجنسیاں مذہبی عناصر کو 'حدود میں رکھنے' میں کردار ادا کرتی ہیں تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟ پھر یہ لوگ بہت سمجھ دار ہیں، یہ جنرل ڈائر کا زمانہ نہیں کہ عوام پر فائر کھول دیا جائے اور کشتوں کے پشتے لگا دیے جائیں بلکہ اب تو ففتھ جنریشن وار فیئر کا زمانہ ہے۔ زہر بھی نہیں دیا جاتا گڑ سے کام لیا جاتا ہے لہٰذا مذہبی جماعتوں کو کنٹرول، کرٹیل (Curtail) اور کنٹین (Contain) کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ چنانچہ ملک میں اسلام بھی ہے، مذہبی جماعتیں اور ادارے بھی فعال ہیں اور عملاً حکمران طبقوں کی خواہش کے مطابق مغربی فکر و تہذیب کا غلبہ بھی ہے اور یہ 'نظام' آسانی سے چلایا جا رہا ہے۔

۲۔ سطور بالا میں جو تجزیہ کیا گیا ہے، اس کی روشنی میں عدلیہ کا کردار بھی سمجھ میں آ جاتا

---

[۱] پاکستان کے حکمران طبقات نے یہ فیصلہ مغرب کے دباؤ پر کیا بلکہ مغرب نے پُر امن طریقوں اور سازشوں سے اقتدار ایسے افراد اور طبقات کو منتقل کیا اور مستقبل میں انہی کو اقتدار میں رکھنے کی کامیاب پلاننگ کی جو اسلام کی بجائے مغربی فکر و تہذیب کو اپنے معاشرے میں رائج کرنے کو تیار تھے اور ہیں۔

[۲] اس کی عبرتناک مثال یہ ہے کہ ایک 'دینی حاکم' (؟) نے نفاذ اسلام کے نام پر ۱۹۷۹ء میں حدود (قوانین) کو آئینی و قانونی ڈھانچے کا حصہ بنا دیا لیکن عملاً یہ حالت ہے کہ پچھلے ۴۲ سال میں ایک بھی حد نافذ نہیں ہوئی۔

ہے۔صرف ممتاز قادری شہیدؒ کے کیس کا جائزہ لے لیجیے۔ابتدائی عدالت کے جج نے فیصلہ دیا کہ ملزم نے اسلامی لحاظ سے کوئی غلط کام نہیں کیا لیکن میں دہشت گردی ایکٹ کی دفعہ فلاں اور فلاں کے تحت اسے سزائے موت دیتا ہوں۔اور جب یہ کیس سپریم کورٹ میں اپیل کے لیے گیا اور ممتاز قادری شہیدؒ کے وکیل نے قرآنی آیات اور احادیث پڑھنا شروع کیں تو عدالت کے معزز ججوں نے کہا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہم شریعہ کے ماہر ججز نہیں ہیں، اگر آپ نے شرعی بنیادوں پر کیس لڑنا تھا تو اسے وفاقی شرعی عدالت میں لے جاتے، ہم تو آئین وقانون کے مطابق فیصلہ کریں گے چنانچہ دو دن بعد انہوں نے فیصلہ سنا دیا اور نچلی عدالتوں کی دی گئی موت کی سزا برقرار رکھی۔

مطلب یہ کہ آئین بنانے والے بہت ہوشیار اور 'سمجھ دار' لوگ تھے۔انہوں نے پاکستانی عوام اور دینی عناصر کی دلجوئی کے لیے آئین میں اسلام کی حمایت میں بہت سی دفعات رکھیں، حتیٰ کہ وہ بھی جو بے معنی اور غیر ضروری تھیں (جیسے یہ کہ ریاست کا مذہب اسلام ہوگا حالانکہ مذہب تو جیتے جاگتے مکلف انسانوں کا ہوتا ہے، بیچاری بے جان ریاست کا کوئی مذہب رکھنے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟) لیکن جو بات آئین میں لکھنا وہ عمداً بھول گئے وہ یہ تھی کہ قرآن وسنت آئین اور قوانین پر غالب ہوں گے یعنی قوانین یا آئین کی کوئی دفعہ اگر قرآن وسنت کے خلاف ہوگی تو اس پر عمل نہیں ہوگا اور ریاست کے مختلف شعبوں (انتظامیہ، عدلیہ، مقننہ وغیرہ) کو چلانے والے افراد کا ہر وہ فیصلہ غیر آئینی متصور ہوگا جو خلافِ قرآن وسنت ہو۔یہ دفعہ آئین میں عمداً اس لیے نہیں رکھی گئی تاکہ فیصلے قرآن وسنت کے مطابق نہ کرنے پڑیں اور وکیلوں اور ججوں کو شریعت نہ پڑھنی پڑے چنانچہ پاکستان کے سارے لاء کالجوں میں مغرب کے اصول قانون، دساتیر اور قوانین کا مطالعہ کرایا جاتا ہے نہ کہ قرآن وسنت، فقہ واصولِ فقہ اور عربی زبان کا۔

قرآن وسنت کی آئین وقوانین پر بالادستی نہ ماننے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جہاں دونوں میں تضاد (Conflict) ہو وہاں فیصلہ آئین وقانون کے مطابق ہوتا ہے اور شریعت کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے حالانکہ جو مسلمان شریعت کے خلاف (اور دیگر وضعی قوانین کے مطابق) فیصلے کریں انہیں قرآن ظالم، فاسق اور کافر قرار دیتا ہے[1] لیکن ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں۔

یہ بات جو ہم کہہ رہے ہیں اس کا توہینِ رسالت اور توہینِ مذہب سے گہرا تعلق ہے کیونکہ

---

[1] المائدہ ۵: ۴۴، ۴۵، ۴۷

توہین رسالت سے متعلق ہمارا قانون ناقص ہے۔ اس میں یہ اسلامی اصول تو لکھا ہوا ہے کہ جو توہین رسالت کرے گا وہ سزائے موت کا مستحق ہوگا لیکن یہ اسلامی اصول نہیں لکھا ہوا کہ اگر کوئی مسلمان غیرت میں آ کر توہین رسالت کرنے والے مجرم کو قتل کر دے اور عدالت مقتول کو توہین رسالت کا مجرم پائے تو شاتم رسول کے قاتل کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی اور اگر عدالت مقتول کو توہین رسالت کا مرتکب نہ قرار پائے تو اسے ناجائز قتل کرنے والے مجرم کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ اسلام کا یہ شرعی ضابطہ ہمارے آئین وقانون میں نہیں لکھا ہوا اس لیے عدالتوں نے ممتاز قادری شہیدؒ کو معافی نہیں دی اور اگر عدالت سیالکوٹ میں سری لنکن غیر مسلم کو توہین رسالت کا مرتکب نہ پائے تو اسے قتل کرنے والوں کو قصاص میں قتل (پھانسی) کی سزا ملنی چاہیے۔ لہٰذا ہمارا مطالبہ ہے کہ یہ اسلامی اصول جو نبی کریم ﷺ کی صحیح احادیث اور اس باب میں آپ (ﷺ) کے متعدد واضح فیصلوں پر مبنی ہے، دستور میں اس کا اضافہ ہونا چاہیے اور پاکستان کے علماء کرام کو اس کا مطالبہ اور اس کی حمایت کرنی چاہیے۔

۳۔ اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہم تشدد اور قوت سے پاکستان میں نفاذ اسلام کے قائل نہیں۔ یہاں خروج (یعنی ریاست کے خلاف بغاوت کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے) کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ شرعاً اس کی گنجائش ہے اور نہ یہ عملاً مفید ہے کیونکہ یہاں دعوت واصلاح کے راستے کھلے ہیں اور دینی قوتیں پُرامن اصلاحی جدوجہد سے لوگوں کے دل ودماغ کو فتح کر کے انہیں اپنا ہمنوا اور ہم خیال بنا کر اقتدار حاصل کر سکتی ہیں۔ مطلب یہ کہ پاکستان میں پُرامن طریقے سے انتقال اقتدار ممکن ہے اور ہمارے دیکھتے انتخابات کے نتیجے میں یہاں کبھی مسلم لیگ (ن) کی حکومت بنتی ہے، کبھی پیپلز پارٹی کی اور کبھی تحریک انصاف کی۔ دینی سیاسی جماعتیں اگر متحد نہیں ہوتیں اور مل کر عوامی حمایت سے سیکولر سیاسی جماعتوں کے خلاف کامیابی حاصل نہیں کرتیں تو یہ ان کی نالائقی، حماقت اور کمزوری ہے، اس میں اسلام اور اس کے سیاسی نظام کا کوئی قصور نہیں۔

طالبان افغانستان کی مثال دینا یہاں غلط ہے کیونکہ افغانستان پر کفار کی فوجوں نے حملہ کر کے ملک پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا اور طالبان کو شرعی حق حاصل تھا کہ وہ کفار کے خلاف مسلح جدوجہد کر کے ملک کو ان سے آزاد کرائیں اور جب اقتدار انہیں مل جائے تو وہ ریاستی قوت سے ملک میں اسلام نافذ کریں، جبکہ پاکستان میں ایسے حالات نہیں ہیں۔

پھر دیکھا جائے تو اکثر دینی سیاسی جماعتوں کا نفاذ اسلام کا تصور ہی ناقص اور غیر متوازن ہے کیونکہ اسلام نام ہی اس چیز کا ہے کہ آدمی اپنی آزاد مرضی سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت قبول کرے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرے۔ معاشرہ اور ریاست بھی افراد ہی سے مل کر بنتے ہیں لہٰذا افراد کا اپنی ذاتی زندگی میں اور معاشرے وریاست میں اپنے دائرہ کار میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا ان کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اور حکمران، فرض کیجیے، اگر صالح مسلمان نہ بھی ہوں تو افراد ۸۰ فیصد سے زیادہ اسلام پر بغیر ریاستی قوت کے محض اپنی نیت وعزم اور معاشرتی اداروں کی تنظیم سے (جیسے مسلم معاشرے میں مساجد، مدارس، فقہ، افتاء کا نظام پہلی صدی ہجری سے عوام اور معاشرے کے ہاتھوں میں ہے اور عملاً چودہ سو سال سے نافذ ہے، بغیر حکومتی قوت کے) عمل کر سکتے ہیں اور آج بھی اس اصول کو توسیع دے کر اور اس پر عمل کر کے بڑی حد تک اسلامی زندگی گزار سکتے ہیں خواہ حکومت اسلامی قوانین کو اقتدار کی قوت سے 'نافذ' نہ بھی کرے۔ اگر افراد اپنی ذاتی زندگی میں اسلام پر عمل نہ کریں اور نہ معاشرتی اداروں کی تنظیم سے اسلامی تعلیمات پر عمل کریں (جبکہ ان دونوں کاموں کے راستے کھلے ہیں) اور دینی قوتوں کے ساتھ مل کر صرف حکومت سے مطالبہ کرتے رہیں کہ وہ اقتدار کی قوت سے اسلام 'نافذ' کرے تو یہ نفاذِ اسلام کا غلط تصور ہے جس کی ہم حمایت نہیں کرتے۔

۴۔ اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ توہین رسالت کے حوالے سے مغربی ممالک کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور یہ کہ مغربی فکر وتہذیب کے حوالے سے ہمارا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے۔

اس بات سے سارے مسلمان واقف ہیں کہ مغرب، جو اس وقت دنیا پر غالب ہے، وہ قانونِ توہین رسالت کا مخالف ہے، وہ علی الاعلان اسے غلط کہتا ہے، اسے آزادیٔ اظہارِ رائے کے خلاف سمجھتا ہے اور مسلم حکومتوں سے اس قانون کے خاتمے کا مطالبہ کرتا رہتا ہے اور ان پر اس قانون کو ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالتا رہتا ہے یا کم از کم اسے غیر مؤثر بنانے اور اس پر عمل کو مشکل بنانے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ ہم آپ دیکھ چکے ہیں کہ وہ توہین رسالت کرنے والے افراد کو حکومت پاکستان اور اس کے اداروں پر دباؤ ڈال کر رہا کروالیتا ہے اور انہیں پاکستان سے نکال کر اپنے ہاں پناہ دیتا ہے۔ (تازہ واقعہ آسیہ مسیح کا ہے)۔ اس کے برعکس اس کے خفیہ دباؤ پر پاکستانی حکومتیں، ادارے اور عدالتیں شاتمینِ رسول کو قتل کرنے والوں کو فوراً پھانسی کی سزا دلواتی ہیں (جیسا کہ ممتاز قادری شہیدؒ کے کیس میں ہو چکا ہے)۔ مغرب کے علانیہ وخفیہ دباؤ کے نتیجے میں قانونِ توہینِ رسالت پر مؤثر عمل

درآمد نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس حساس اور جذباتی معاملے میں لوگ خود شاتمین رسول کو سزا دینے پر تل جاتے ہیں اور حکومتوں اور عدالتوں پر اعتماد کرنے کی بجائے خود انہیں قتل کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں صریح الفاظ میں یہود و نصاریٰ کو کافر کہا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن اور بدخواہ ہیں، انہیں دین سے پھیرنا چاہتے ہیں لہٰذا ان سے دوستی کی گنجائش نہیں [1] اور اب تو یہودیت و نصرانیت بھی پیچھے رہ گئی ہے اور موجودہ مغربی فکر و تہذیب تو کفر، الحاد اور زندقہ سب کا مجموعہ ہے کیونکہ ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم وغیرہ توحید، رسالت اور آخرت کے منکر ہیں اور اس فکر و تہذیب کے علمبردار مغربی ممالک کی اسلام اور مسلم دشمنی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انہوں نے مسلمان ملکوں کو غلام بنایا اور انہیں اسلامی زندگی گزارنے کی اجازت دینے کی بجائے اپنی فکر و تہذیب پر مبنی سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، قانونی اداروں کے تحت زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا اور جب مجبوراً مغربی استعمار کو مسلمان ممالک کو کچھ آزادی دینا پڑی تو اب وہ امن کا چولا پہن کر پُرامن طریقوں اور سازشوں سے اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کر رہا ہے۔ اور اس نے اکثر مسلم حکمرانوں کو اپنے دباؤ میں لے رکھا ہے اور انہیں اسلام پر عمل کرنے کا وہ کوئی موقع دینے کو تیار نہیں۔

ان حالات میں مسلم معاشرے میں دینی قوتوں اور علماء کرام کا فرض تھا کہ وہ مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کو رد کر دیتیں اور اس کی بجائے اسلامی فکر کے استقلال اور اس پر مبنی اجتماعی اداروں کے قیام کا مطالبہ کرتیں لیکن بدقسمتی سے دینی لوگوں کے ایک طبقے نے مغرب کی اسلام دشمنی اور الحادی تہذیب کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور اس سے مرعوب ہو کر اسے اپنانے کے راگ الاپنے لگے۔ برصغیر میں یہ سلسلہ سرسید سے شروع ہو کر، قادیانی، چکڑالوی، پرویز سے ہوتا ہوا عصر حاضر میں مولانا وحید الدین خاں اور جاوید غامدی تک آپہنچا ہے۔ دوسری طرف بعض علماء اور سکالرز نے مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اسلام اور مغربی تہذیب کے کفر کو ملا کر ایک ملغوبہ تیار کرنے کو مسئلے کا حل جانا اور مغرب کی الحادی جمہوریت میں کچھ اسلام داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا اور مغرب کی غیر اسلامی سودی بنکنگ میں کچھ اسلامی اصول کاغذی طور پر داخل کر کے اسے 'اسلامی بنکنگ' قرار دے دیا۔ اسی طرح مغرب کے ہیومنزم، سیکولرازم اور لبرل

---

[1] آل عمران ۳: ۱۱۸-۱۲۰، المائدہ ۵: ۵۱، ۵۷، ۸۲

ازم پر مبنی بنیادی حقوق کو عین اسلامی قرار دے دیا۔ مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ذہن کے علماء اب کہتے ہیں کہ توہین رسالت کے مرتکب کو ماورائے عدالت قتل کرنا غلط ہے اور یہ قانون کو ہاتھ میں لینا ہے اور یہ سراسر غلط ہے۔ حالانکہ پچھلے چودہ سو سال سے جمہور علماء وفقہاء کا یہ مسلک چلا آ رہا ہے کہ ہر قسم کے فیصلے عدالتوں میں قرآن وسنت کے مطابق ہوں گے کوئی قانون کو ہاتھ میں نہیں لے گا اور نہ ماورائے عدالت فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا لیکن اس اصول میں نبی کریم ﷺ نے ایک استثناء یہ قرار دیا کہ توہین رسالت کے حساس اور جذباتی معاملے میں اگر کوئی مسلمان وفورِ غیرتِ ایمانی سے کسی شاتمِ رسول کو قتل کر دے تو عدالت یہ دیکھے گی کہ اس نے قتل توہینِ رسالت کی وجہ سے کیا یا کسی اور وجہ سے۔ اگر مقتول شاتم توہین رسالت کا مرتکب پایا جاتا تو آپ ﷺ شاتم کے قاتل کو کوئی سزا نہ دیتے بلکہ بعض واقعات میں تو آپ ﷺ نے اس کی تحسین کی [۱]۔ لیکن اگر کوئی کسی دوسری وجہ سے کسی مسلمان یا غیر مسلم کا خون بہائے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

محدثین کی یہ حدیثیں اور فقہاء کی یہ تصریحات امت چودہ سو سال سے پڑھتی چلی آ رہی ہے اور اس پر امت کا عمل رہا ہے لیکن آج مغرب سے مرعوب بعض علماء کہنے لگے ہیں کہ توہینِ رسالت میں بھی شاتم کو ماورائے عدالت قتل کرنا جرم ہے اور یہ قانون کو ہاتھ میں لینا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ مغرب کے قانون میں بلاشبہ ایسا ہی ہے لیکن اسلامی شریعت میں تو ایسا نہیں ہے کیونکہ محمد رسول اللہ (ﷺ) سے بڑھ کر کوئی منصف نہیں ہے اور آپ ﷺ کی عدالت سے بڑی کوئی عدالت نہیں ہے اور اللہ نے اپنی کتاب میں اعلان فرما دیا ہے کہ جو محمد رسول اللہ (ﷺ) کے فیصلے پر راضی نہ ہو اس کا ایمان قابل قبول نہیں [۲] تو مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب آج کے بعض علماء کس منہ سے یہ کہتے ہیں کہ شاتم رسول کو ماورائے عدالت قتل کرنا جرم ہے۔ اسلامی شریعت کا ضابطہ یہ ہے، محمد رسول اللہ (ﷺ) کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسے معاملے میں عدالت یہ دیکھے گی کہ قاتل نے یہ فعل کیوں کیا؟ اگر اس نے توہین رسالت کی وجہ سے کیا تو اسے معافی ہے۔ اور اگر اس

---

[۱] دیکھیے کتب حدیث وسیرت میں کئی واقعات مثلاً حضرت محمد بن مسلمہؓ کا یہودی شاتم رسول کعب بن اشرف کا قتل جس پر آپ ﷺ نے فرمایا 'افلحت الوجوہ' (صحیح بخاری: ۴۰۳۷ وطبقات ابن سعد: ۲/ ۳۴) اور نابینا صحابی حضرت عمیر بن عدی خطمیؓ کے ہاتھوں شاتمہ عصماء بنت مروان کے قتل کا واقعہ (مجمع الزوائد: ۶/ ۲۶۰، ابن تیمیہ، الصارم المسلول: ۹۴، واقدی: ۱/ ۶۴)

[۲] النساء ۴: ۵۶

نے کسی دوسری وجہ سے کیا تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔لیکن ہمارا عدالتی نظام ناقص ہے۔ یہ غیر اسلامی بھی ہے اور ناکارہ بھی اور یہ بیرونی اور اندرونی دباؤ بھی قبول کرتا ہے۔

افسوس کہ شریعت کے اس قانون واصول پر کوئی عمل نہیں کرتا اور آج کے بعض مغرب زدہ علماء اس پر عمل کا مطالبہ بھی نہیں کرتے بلکہ مغرب کی الحادی تہذیب کے علمبردار ممالک کے دباؤ کی وجہ سے مسلمان ملکوں میں ایسا ماحول بنادیا گیا ہے کہ بعض علماء اسلام کے اس قانون ہی کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور سیکولر ولبرل حکمرانوں، وکیلوں اور ججوں کی طرح یہ کہنے لگے ہیں کہ شاتم رسول کو قتل کرنا قانون ہاتھ میں لینا ہے اور یہ ماورائے عدالت ناجائز قتل ہے۔اس پر تو یہی مثال صادق آتی ہے کہ۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ فالی اللہ المشتکی۔

بقیہ: پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی۔اسباب وعلاج

ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ دینی سیاسی جماعتوں کے زیرک سیاستدان یہ بات کیوں نہیں سمجھتے کہ اگر کوئی دینی سیاسی جماعت ایک مسلک پر مبنی ہو تو وہ کبھی بھی کامیاب ہو کر حکومت نہیں بنا سکتی اور اقتدار کو دین کے لیے استعمال نہیں کر سکتی کیونکہ دوسرے مسالک کے لوگ انہیں ووٹ نہیں دیں گے لہٰذا عقل وفراست اور کامن سینس کا تقاضا ہے کہ یا تو سب مسالک نفاذِ شریعت اور ایک صحیح اسلامی ریاست کے قیام کے لیے متحد ہو جائیں یا پھر مسلکی جماعت کی بجائے ایسی جماعت بنائیں جو سب لوگوں کے لیے ہو یا سب مل کر کسی سیاسی جماعت سے معاہدہ کرلیں۔موجودہ صورت میں تو یہ پچھلے ۷۴ سال سے کامیاب نہیں ہوئیں اور آئندہ قیامت تک بھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔اسی طرح انہیں چاہیے کہ مساجد پر سے مسلک کا ٹھپا ہٹائیں، مسجدوں کو اللہ کا گھر قرار دیں اور مسجد کمیٹیوں میں سارے مسالک کے لوگ ڈالیں اور مسجدوں کو سارے مسالک کے لیے کھول دیں۔دینی مدارس میں بھی وہ ایک وفاق پر متحد ہو جائیں جس کا ایک نصاب اور نظام امتحان ہو۔نصاب میں تقابلی مطالعے کو فروغ دیا جائے تا کہ ایک دوسرے کے مسالک کے ریشنل کو سمجھا جائے۔دینی مدارس کے نصابات پر نظر ثانی کی جائے۔اس میں 'دنیاوی' علوم کو بھی شامل کیا جائے تا کہ مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ معاشرے اور ریاست کے لیے مفید خدمات انجام دے سکیں اور ان کی اصلاح کے لیے اقدامات کر سکیں۔

اگر علماء کرام ان خطوط پر کام کریں اور حکومتوں کے جال سے بچیں تو مسلک پرستی، فرقہ واریت اور مذہبی انتہا پسندی کا خاتمہ ہو جائے گا، ان شاء اللہ۔

توہینِ رسالت

مولانا پروفیسر محمد رفیق

کیا توہینِ رسالت پر سزائے موت کا قانون غیر شرعی ہے؟

ہمارے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان میں دفعہ 295-C کے مطابق توہینِ رسالت کے مرتکب شخص کے لیے موت کی سزا مقرر ہے۔ یہ قانون وفاقی شرعی عدالت، پارلیمنٹ اور حکومت پاکستان کی منظوری سے بنا اور ۱۹۹۱ء سے نافذ العمل ہے۔ بعد میں اسے آئین پاکستان کا حصہ بھی بنا دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ قانون اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے۔ اس کی تشکیل میں ملک کے جید علمائے کرام کی مشاورت شامل تھی اور اب اس پر اتفاق واجماع ہو چکا ہے۔

مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جب یہ قانون آئین کا حصہ بنا ہے اُس وقت سے یہ اغیار کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے اور اسلام دشمن طبقے اسے بدلوانے کے لیے ہر حربے اور حیلے بہانے سے کام لے رہے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی میڈیا کے ساختہ پرداختہ اسلامی سکالر جناب جاوید احمد غامدی بھی ہیں جنہوں نے اپنے ایک بیان میں مذکورہ متفقہ اور اجماعی قانون کو غیر شرعی قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے شرعی نصوص اور اجماعِ امت کے خلاف مغالطہ آمیز تاویلات وتلبیسات پیش کی ہیں۔

اُن کے اس دعوے اور بیانیے کا علمی تجزیہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کا تعارف بھی ہو جائے کیونکہ قرآن سے مستنبط اصول حدیث کا یہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ متن سے پہلے اسناد کو اور روایت سے پہلے راوی کو دیکھنا اور جانچنا لازم ہے۔ اسلام میں کسی شخص کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کسی ایسے آدمی کو امام مسجد یا مؤذن نہیں بنا سکتے جو اپنی ذاتی زندگی میں شرابی، جواری یا زانی ہو۔

موصوف کوئی مستند عالم دین نہیں ہیں۔ نہ انہوں نے کسی دینی مدرسہ سے علوم اسلامیہ کی باقاعدہ تحصیل کی ہے۔ وہ محض گریجوایٹ ہیں۔ مگر یہ ہیرو سے زیرو اور زیرو سے ہیرو بنانے والے ہمارے میڈیا کا کمال اور کرشمہ ہے جس نے انہیں اسلامی سکالر مشہور کر رکھا ہے۔ موصوف پاک پتن (پنجاب) کے ایک نواحی گاؤں پیر کریاں میں پیدا ہوئے۔ پھر لاہور آ گئے۔ ذات کے ککے زئی

ہیں لیکن انہوں نے اپنا نسب تبدیل کر لیا ہے اور یمن کے ایک عرب قبیلے ُغامد ُسے جعلی نسبت جوڑ کر اپنے آپ کو غامدی کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ علمائے دین سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ اسلام میں کسی شخص کا اپنی نسبت تبدیل کر لینا کبیرہ گناہ ہی نہیں بلکہ ایک صحیح حدیث میں اسے کافرانہ فعل قرار دیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"كُفْرٌ بِالْمَرْءِ اِدِّعَاءُ نَسَبٍ، لَا يَعْرِفُهُ اَوْ جَحَدَهُ وَاِنْ دَقَّ." [1]

"یہ کفر ہے کہ آدمی ایسی نسبت کا دعویٰ کرے جس کو وہ خود نہیں پہچانتا، یا اپنے نسب کی کسی چیز کا انکار کرے اگرچہ وہ معمولی قسم کی ہو۔"

موصوف ستر کی دہائی میں جماعت اسلامی کے رکن رہے مگر اپنی دروغ گوئی کے باعث جماعت سے نکال دیے گئے۔ اُن کے اس اخراج میں خود مولانا مودودیؒ نے حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی شاگردی نہیں بلکہ مریدی اختیار کر لی تاکہ کوئی علمی نسبت قائم ہو۔ پھر اُن کے بعض تفردات اور متنازعہ نظریات کو قبول کر لیا اور ان میں اتنی شدت پیدا کر لی کہ اہل سنت کی راہ سے پھر گئے۔ بعد میں جب انہیں خاص حلقوں کی پذیرائی اور سرپرستی حاصل ہو گئی تو وہ پہلے ضیاء الحق اور پھر پرویز مشرف جیسے جرنیل آمروں کے منظور نظر ہو گئے۔ انہیں ۲۰۰۶ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کا ممبر بھی بنایا گیا۔ ان سے بعض متنازعہ تقریریں اور بیانات دلوائے گئے۔ ان خدمات کے صلے میں اُن پر اتنا ہُن برسنا شروع ہو گیا کہ وہ شخص جو کبھی لاہور کے محلہ سلطان پورہ کی ایک تنگ گلی میں ڈھائی تین مرلے کے گھر کا باسی تھا، اب بغیر کسی ذریعۂ معاش کے ڈی ایچ اے لاہور کے ڈبل جی بلاک کی ایک شاندار کوٹھی کا رہائشی ہو گیا جہاں ہمارے ملک کے اصل فیصلہ سازوں کی جانب سے اُسے خصوصی پروٹوکول اور سیکورٹی مہیا کی گئی۔

موصوف بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ نہایت محنتی، ذہین، ادیب، شاعر، خطیب، فلسفی، جاہ پسند اور بااعتماد دروغ گو واقدی ہیں۔ اپنی لفاظی اور سخن سازی سے ایسے مسلمانوں کو بہکانے کا خوب ملکہ رکھتے ہیں جو دین سے ناواقف ہوں۔ ایک مرتبہ کسی انتہا پسند نے اُن پر پستول سے قاتلانہ حملہ کر دیا لیکن وہ بال بال بچ گئے۔ البتہ اس موقع پر اُن کے ایک ساتھی سید منظور الحسن

[1] ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۷۴۴، مسند احمد ۲/ ۲۱۵، الصحیحہ: ۳۳۷۰

شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ''خوفِ فسادِ خلق'' کی ایسی فضا سے گھبرا کر وہ ملائشیا ہجرت کر گئے۔ وہاں چند سال رہنے کے بعد اب امریکہ کی گود میں جا بسے ہیں۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اپنے عقائد و نظریات کے اعتبار سے کٹر منکر حدیث، لبرل، متجدد اور مغرب زدہ ہیں۔ اسلامی دین و شریعت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے رہنا اور مسلم معاشرے کو مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنا ان کا محبوب مشغلہ اور ذریعۂ معاش ہے۔ ملک بھر کے معتمد علمائے کرام کی نظر میں وہ گمراہ اور بے دین ہیں مگر ہمارے بعض جدید تعلیم یافتہ، لبرل اور سیکولر ذہن کے حامل مقتدر حلقوں کا دعویٰ ہے کہ پاکستان بھر میں غامدی سے بڑھ کر کوئی اور عالم دین نہیں۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

اب ہم اُن کے اس بیان کا علمی اور شرعی جائزہ لیں گے جو انہوں نے توہینِ رسالت پر سزائے موت کے ملکی قانون کے خلاف دیا ہے کہ ''یہ قرآن کے بھی خلاف ہے، حدیث کے بھی خلاف ہے اور فقہائے احناف کی رائے کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے اسے لازماً تبدیل ہونا چاہیے۔ یہ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے بدنامی کا باعث بن رہا ہے۔''

کیا یہ قانون قرآن کے خلاف ہے؟

غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ توہینِ رسالت کے مرتکب فرد کو موت کی سزا دینے کا موجودہ ملکی قانون قرآن کے خلاف ہے؟ مگر انہوں نے قرآن کی کسی ایسی آیت کا حوالہ نہیں دیا (اور نہ کبھی دے سکتے ہیں) جہاں یہ وارد ہوا ہو کہ توہین رسالت کرنے والے کسی شخص کے لیے موت کی سزا نہیں ہے۔ محض یہ بات کہ فلاں حکم چونکہ قرآن میں مذکور نہیں اس لیے وہ خلافِ قرآن ہے ایک ایسی منطق ہے (جو پرویز اور دوسرے تمام منکرین حدیث کی پسندیدہ دلیل بھی ہے) جسے اگر قبول کر لیا جائے تو اس سے پوری اسلامی شریعت کا تیا پانچا کیا جا سکتا ہے۔ ایسے سیکڑوں شرعی احکامات ہیں جو قرآن سے ثابت نہیں اور نہ اُس میں مذکور ہیں مگر حدیث و سنت اور اجماعِ امت سے ثابت شدہ ہیں۔ جیسے مرتد کے لیے سزائے قتل، شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی سزائے موت، شراب نوشی پر اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا۔ کتے، پالتو گدھے اور تمام درندہ جانوروں کے گوشت کا حرام ہونا، پانچ وقت کی نماز کا فرض ہونا، عورتوں کے لیے خاص ایام میں

نماز نہ پڑھنا اور بعد میں اس کی قضا نہ کرنا، وضو میں موزوں پر مسح کرنا، زکوٰۃ اور چوری کا مقررہ نصاب ہونا، سورۂ الفاتحہ کے بعد آمین کہنا، تلاوتِ قرآن کے دوران چودہ (۱۴) مقامات پر سجدۂ تلاوت کرنا، مسلمان کی میت کو غسل دینا اور کفن پہنانا، شہید کی میت کو بغیر غسل اور کفن کے دفنانا، مردہ مچھلی کا حلال ہونا، شراب اور بتوں اور مردہ جانوروں کی تجارت کا حرام ہونا، قاتل شخص کا مقتول کی وراثت سے محروم ہونا، مسلمان اور کافر کا ایک دوسرے کے لیے وارث نہ ہونا، ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کا ناجائز ہونا، مردوں کے لیے ریشم اور سونا پہننے کی حرمت ان میں سے کوئی ایک حکم بھی نہ تو قرآن سے ثابت ہے اور نہ اُس میں مذکور ہوا ہے مگر یہ سب اسلامی شریعت کے مسلّمہ احکام ومسائل ہیں۔ تو کیا ان تمام شرعی احکامات کو قرآن کے خلاف ہونے کی دلیل اور منطق کی بنیاد پر دریا برد کیا جاسکتا ہے؟ غامدی صاحب تو ایسا کرنے کے لیے بھی جلد تیار ہو جائیں گے مگر امتِ مسلمہ کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی کہ وہ اپنی شریعت کو ضائع کر کے گمراہ ہو جائے۔

پھر قرآن مجید ہی میں آیا ہے کہ:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾ [الاحزاب ۳۳:۵۷]

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دیتے ہیں، ان پر اللہ نے دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینے سے کیا مراد ہے جس کا انجام دنیا اور آخرت میں لعنت اور دوزخ کا ذلت ناک عذاب ہے؟ اللہ کو ایذا دینے کا مطلب ایک متفق علیہ حدیث قدسی کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ، بِيَدِي الْاَمْرُ، اُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ." [1]

''ابن آدم (انسان) زمانے کو گالی دیتا ہے تو مجھے ایذا دیتا ہے۔ حالانکہ میں ہی زمانہ ہوں۔

[1] بخاری، رقم الحدیث: ۴۸۲۶۔ مسلم، رقم الحدیث: ۵۸۷۳۔ ابوداؤد، رقم الحدیث: ۵۲۷۴

سارے معاملات میرے ہاتھ میں ہیں، میں ہی دن رات کو بدلتا ہوں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا زمانے کو گالی دینا اللہ کو گالی دینا ہے۔ گویا زبان سے کسی کو گالی دینا اُسے ایذا دینا ہوتا ہے خواہ یہ گالی خدا کو دی جائے، یا رسول ﷺ کو دی جائے یا کسی اور شخص کو دی جائے۔

'ایذا' کے معنی قرآن کی روشنی میں سمجھے جاسکتے ہیں۔ سورۃ التوبہ میں منافقین کے بارے میں آیا ہے کہ:

﴿وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ﴾ [التوبہ ۹:۶۱]

''اور اُن (منافقین) میں سے بعض ایسے ہیں جو نبی کریم ﷺ کو یہ کہہ کر ایذا پہنچاتے ہیں کہ یہ شخص تو کان کا کچا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کے اسلوب بیان میں لفظ 'ایذا' کے معنی زبان سے کسی کے خلاف کچھ کہنے کے ہوتے ہیں جیسے اُسے گالی دینا، پاگل یا بے وقوف کہنا وغیرہ۔

عربی زبان میں 'کان کا کچا' (اُذُنٌ) ایسے شخص کو کہتے ہیں جس میں عقل نہ ہو اور وہ ہر کسی کی اچھی بُری بات کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرلے۔ ظاہر ہے نبی کریم ﷺ کو ایسا کہنا آپ ﷺ کی شان میں گستاخی ہے۔

اوپر سورۃ الاحزاب کی مذکورہ آیت کی عملی تفسیر وہ احادیث کر دیتی ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے یہودی سردار کعب بن اشرف اور ابو رافع عبداللہ بن ابی الحقیق کو قتل کرائے جانے کا سبب بیان فرمایا ہے کہ ان دونوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو ایذا دی تھی۔

صحیح بخاری میں کعب بن اشرف کے قتل کا سبب آنحضرت ﷺ نے یوں فرمایا کہ:

''فَاِنَّهٗ قَدْ اٰذَی اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ.''[1]

''پس بے شک اس شخص نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو ایذا دی ہے۔''

اور ابو رافع کے قتل کی وجہ صحیح بخاری میں یوں بیان ہوئی ہے کہ:

---

[1] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۲۵۱۰

"كَانَ اَبُوْا رَافِعٍ يُؤْذِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَيُعِيْنُ عَلَيْهِ." [۱]

''ابو رافع وہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیتا اور دوسروں کو آپ ﷺ کے خلاف بھڑکاتا تھا۔''

معلوا ہوا ان دونوں یہودیوں کو اس لیے قتل کیا گیا تھا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو ایذا دی تھی اور زبان سے آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کی تھی۔

۲۔ کیا مذکورہ قانون حدیث کے خلاف ہے؟

مذکورہ قانون کے خلاف غامدی صاحب کی دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث کے خلاف ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم یہ جائزہ لیں کہ توہین رسالت کا موجودہ ملکی قانون (295-C) حدیث کے خلاف ہے یا نہیں، یہ بتانا مناسب بلکہ ضروری سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کی نظر میں خود حدیث کی کیا حیثیت اور کیا مقام ہے؟ جس کی بنیاد پر وہ اس قانون کو خلافِ حدیث کہہ کر ردّ کر رہے ہیں۔ موصوف اپنی عادت کے مطابق الفاظ کی کچھ ہیرا پھیری کے ساتھ اپنی فخریہ ضخیم کتاب 'میزان' میں لکھتے ہیں:

''رسول اکرم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبارِ آحاد جنہیں بالعموم حدیث کہا جاتا ہے، اُن کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا، اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔'' [۲]

گویا ان کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق:

۱۔ حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام ہے

۲۔ حدیث سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا

۳۔ حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ اور عمل ثابت نہیں ہوتا

---

[۱] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۴۰۳۹

[۲] میزان، ص: ۱۵، طبع سوم، مئی ۲۰۰۸ء، لاہور، اصول و مبادی، ص: ۱۱، طبع دوم فروری ۲۰۰۵ء، لاہور

اب دیکھ لیجیے غامدی صاحب کا کمال اور کرتب کہ وہ ایک طرف تو ہمیں یہ سمجھاتے ہیں کہ حدیث سے دین وشریعت کا کوئی عقیدہ یا عمل ہی ثابت نہیں ہوتا اور دوسری طرف توہین رسالت کے موجودہ قانون کو اسی حدیث کی بنیاد پر اسے خلافِ حدیث اور غیر شرعی قرار دیتے ہیں۔

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

سوال یہ ہے کہ جب حدیث ماخذ شریعت ہی نہیں تو اس کی بنیاد پر کسی امر کے شرعی یا غیر شرعی ہونے کا فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟

اب ہم چند ایسی صحیح احادیث بیان کریں گے جن کی بنا پر فقہائے اسلام نے توہین رسالت کے مرتکب شخص کو متفقہ طور پر واجب القتل قرار دیا ہے۔

واضح رہے کہ امت میں کسی شرعی امر پر اہل علم کا اتفاق واجماع صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب اس کی پشت پر قرآن وسنت کی کوئی نص صریح یا قطعی دلیل موجود ہوتی ہے۔ ورنہ جہاں تک قیاس واجتہاد کا معاملہ ہے تو اس وسیع دائرے میں فقہا کے درمیان اکثر اختلافِ رائے پایا جاتا ہے جو فی نفسہ برا یا ضرر رساں نہیں ہے بلکہ اسلامی شریعت کا تنوع اور یُسر ہے۔

۱۔ صحیح بخاری میں جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا:

"مَنْ لِكَعْبِ ابْنِ الْأَشْرَفِ؛ فَإِنَّهُ قَدْ آذَى اللهَ وَرَسُوْلَهُ، فَقَامَ مُحَمَّدُ بْنُ مُسْلَمَةَ: أَتُحِبُّ أَنْ أَقْتُلَهُ؟ قَالَ: نَعَمْ."[1]

"کون ہے جو کعب بن اشرف کی خوب خبر لے؟ اُس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو 'ایذا' پہنچائی ہے اور ستایا ہے۔ اس پر محمد بن مسلمہ (انصاریؓ) نے کھڑے ہو کر عرض کیا: کیا آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ میں اُسے قتل کردوں؟ فرمایا: ہاں۔"

بارگاہِ رسالت سے اِذن پاتے ہی محمد بن مسلمہؓ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ کعب بن اشرف کی طرف گئے اور حیلے بہانے سے اُسے قتل کردیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ان سب قاتلوں کو دعا دی۔ یہ سن ۳ ہجری کا واقعہ ہے۔

۲۔ دوسرا واقعہ ابورافع عبداللہ بن ابی الحقیق یہودی کے قتل کا ہے جس کے بارے میں صحیح

---

[1] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۷۰۳۴

بخاری میں یوں مذکور ہے۔

"عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ: بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلٰی اَبِیْ رَافِعٍ الْیَهُوْدِیِّ رِجَالًا مِنَ الْاَنْصَارِ فَاَمَّرَ عَلَیْهِمْ عَبْدَ اللّٰہِ بْنَ عَتِیْكٍ، وَكَانَ اَبُوْ رَافِعٍ یُؤْذِیْ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ وَیُعِیْنُ عَلَیْهِ."[۱]

''حضرت براء (بن عازب ؓ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو رافع یہودی (کو قتل کرانے) کے لیے چند انصاری آدمیوں کو منتخب فرمایا اور عبداللہ بن عتیک ؓ کو ان کا امیر مقرر کیا کیونکہ ابو رافع رسول اکرم ﷺ کو ایذا پہنچاتا اور لوگوں کو آپ ﷺ کے خلاف لوگوں کی مدد کرتا تھا۔''

۳۔ اسی سلسلے کا تیسرا واقعہ سنن ابی داؤد میں یوں مذکور ہوا ہے:

عَنْ عَلِیٍّ، اَنَّ یَهُوْدِیَّةً كَانَتْ تَشْتِمُ النَّبِیَّ ﷺ وَ تَقَعُ فِیْهِ، فَخَنَقَهَا رَجُلٌ حَتّٰی مَاتَتْ فَاَبْطَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ دَمَهَا.[۲]

''ایک یہودی عورت نبی کریم ﷺ کو گالیاں دیتی رہتی تھی۔ اُسے ایک آدمی نے گلا دبا کر ہلاک کر دیا تو رسول اکرم ﷺ نے اس عورت کا خون باطل (رائیگاں) قرار دیا۔''

مطلب یہ ہے کہ اس گستاخ یہودی عورت کے قاتل سے نہ قصاص لیا گیا، نہ اُس سے دِیت طلب کی گئی اور نہ اُس پر کوئی کفارہ عائد فرمایا۔ یوں اس قتل کو جائز ٹھہرایا۔

مذکورہ بالا صحیح احادیث کے علاوہ اگرچہ بعض دوسری احادیث میں بھی اسی قسم کے کچھ واقعات ملتے ہیں لیکن ہم نے صرف تین حوالوں پر اکتفا کیا ہے کیونکہ اہل ایمان کے لیے یہی کافی ہیں اور منکرین کو زیادہ حوالے دینا بے کار ہے۔

۴۔ کیا مذکورہ قانون فقہائے احناف کی رائے کے خلاف ہے؟

غامدی صاحب کی تیسری دلیل یہ ہے کہ توہین رسالت کا قانون چونکہ فقہائے احناف کی رائے کے خلاف ہے لہٰذا یہ غیر شرعی اور نا قابل قبول ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ 'اصول'

---

[۱] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۴۰۳۹

[۲] سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۴۳۶۲

ہی بنیادی طور پر غلط اور محض جہالت پر مبنی ہے کہ اگر کوئی امر فقہائے احناف کی رائے کے خلاف ہوتو وہ لازماً غیر شرعی اور نا قابل قبول ہو جائے گا۔ اس قسم کا دعویٰ صرف غامدی جیسے میڈیا سکالر ہی کر سکتے ہیں جنہوں نے اصول فقہ کی کوئی کتاب ہی نہ پڑھی ہو مگر وہ ناواقف لوگوں کے سامنے اپنی علمیت کی دھونس جماتے ہوں۔

فقہائے احناف کی کسی رائے یا فتوے کو صرف حنفی مفتیانِ کرام ہی بہتر جانتے ہیں۔ غامدی صاحب کو فقہ حنفی کی نمائندگی اور ترجمانی کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ اگر انہیں یہ جاننا ہو کہ توہین رسالت پر سزائے موت کی سزا فقہ حنفی میں ہے یا نہیں تو انہیں لاہور کے جامعہ اشرفیہ اور جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن جیسے معتبر حنفی دار الافتاء میں سے کسی ایک سے استفتاء کر کے معلوم کر لینا چاہیے۔ مگر موصوف ایسا کرنے کی زحمت کیوں گوارا کریں گے کیونکہ ان کے پیش نظر اور مقصد دین اسلام کا صحیح فہم وافہام نہیں بلکہ اس کا کامل انہدام ہے۔ جس کے لیے وہ دن رات ایک کر کے اپنے آقایانِ ولی نعمت کی نمک حلالی کرتے ہیں۔ اُن کا حال تو یہ ہے کہ وہ اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے حنفی فقہ کے مسلّمات ہی کا نہیں بلکہ بہت سے اجماعی شرعی احکام ومسائل کا بھی انکار کر چکے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں جیسے وہ مرتد کے لیے سزائے قتل، شادی شدہ زانی کے لیے رجم (سنگساری) کی حد اور شراب نوشی پر اسّی (۸۰) کوڑوں کی سزا وغیرہ غامدی صاحب ان سب کے منکر ہیں۔

پھر جہاں تک فقہ حنفی کا تعلق ہے تو ہین رسالت کا ارتکاب کرنے والے شخص کے بارے میں اس کا فتویٰ یہ ہے:

"وَلَا شَكَّ وَلَا شُبْهَةَ فِيْ كُفْرِ شَاتِمِ النَّبِيِّ ﷺ وَفِيْ اسْتِبَاحَةِ قَتْلِه، وَهُوَ الْمَنْقُوْلُ عَنِ الْأَئِمَّةِ الْأَرْبَعَةِ."[1]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شاتم و گستاخ کے کفر اور واجب القتل ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور چاروں اماموں سے یہی منقول ہے۔''

دراصل توہین رسالت پر سزائے قتل کا حکم اسلامی فقہ وشریعت کا متفقہ اور مجمع علیہ مسئلہ ہے۔ اس بارے میں الدکتور وہبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں:

---

[1] فتاویٰ شامی، ۳/ ۳۱۸، ۴۰۶

"مَنْ سَبَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَوِ النَّبِيَّ اَوْ اَحَدًا مِنَ الْمَلَائِكَةِ اَوِ الْاَنْبِيَاءَ فَاِنْ كَانَ مُسْلِمًا قُتِلَ اِتِّفَاقًا."(۱)

''جس شخص اللہ تعالیٰ کو یا نبی کریم ﷺ کو یا کسی فرشتے کو یا نبیوں کو گالی دے، اگر وہ مسلمان ہوتو اسے قتل کیا جائے گا، اسی پر سب کا اتفاق ہے۔''

اگر غامدی صاحب نے توہین رسالت کی سزا جاننے کے لیے صرف امام ابن تیمیہؒ کی مشہور ومعروف کتاب ''الصارم المسلول علی شاتم الرسول'' ہی پڑھی ہوتی تو وہ کبھی یہ دعویٰ نہ کرتے کہ پاکستان میں توہین رسالت پر سزائے موت کا قانون ''قرآن کے بھی خلاف ہے، حدیث کے بھی خلاف ہے اور فقہائے احناف کی رائے کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے اسے لازماً تبدیل ہونا چاہیے۔ یہ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے بدنامی کا باعث بن رہا ہے۔''

آخر میں ہم عرض کریں گے کہ اگر غامدی صاحب پاکستان میں نافذ العمل توہین رسالت پر سزائے موت کے قانون کو واقعی غیر شرعی سمجھتے ہیں اور مخلصانہ طور پر اسے بدلوانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے قانونی اور آئینی طریق کار اور فورم موجود ہے۔ وہ جلد اپنے وطن تشریف لائیں۔ یہاں کی وفاقی شرعی عدالت میں پیش ہوکر اس کے سامنے مذکورہ قانون کے غیر شرعی ہونے پر دلائل دیں۔ اگر عدالت اُن کے دلائل سے مطمئن ہوجائے گی تو ان کے حق میں فیصلہ دے کر اس قانون کو کالعدم قرار دے گی اور ریاست کو حکم جاری کر کے اسے اس کا پابند کرے گی کہ وہ متذکرہ قانون کو ایک مقررہ مدت کے اندر اندر بدل دے تا کہ اس قانون کے باعث ''پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی جو بدنامی ہو رہی ہے'' اس سے اولین فرصت میں بچا جا سکے۔'' اگر وہ اس قانونی طریقے کو نہیں اپناتے تو پھر ملک کے کچھ جید علمائے دین کو منصف مان کر ان کے پینل کے سامنے اس قانون کے بارے میں ہم سے مناظرہ کرلیں تا کہ اس اہم مسئلے کا فیصلہ ہو سکے۔ لیکن ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ غامدی صاحب ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو بھی قبول نہیں کریں گے۔ اُن کی ترجیحات اور مقاصد واہداف دوسرے ہیں۔ اُن کا حال تو یہ ہے ؎

بنا ہے شاہ کا مصاحب، پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

---

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۶/ ۱۸۴

توہینِ رسالت　　　　سید خالد جامعی

واقعۂ سیالکوٹ۔حکمرانوں،لبرلز اور متجددین کا غلط رویہ

* عمران خان نے کہا کہ ایک غیر ملکی کی لاش جلنے کے واقعے پر قوم کے سر شرم سے جھک گئے ہیں۔سوال یہ ہے کہ کراچی میں ایم کیو ایم نے گارمنٹ فیکٹری کے تین سو کارکنوں کو آگ لگا کر زندہ جلایا تو اس وقت قوم کا سر کہاں تھا؟ تین سو انسانوں کو جلانے والی ایم کیو ایم آج اقتدار میں شریک ہے؟ عمران خان کی حکومت اور پاکستان کا سر شرم سے کیوں نہیں جھک رہا؟

* عمران خان کہہ رہے ہیں کہ توہینِ رسالت والا بغیر مقدمہ چلائے جیل چلا جاتا ہے، انہیں وکیل نہیں ملتا، جج بھی کیس سننے سے گریز کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ توہینِ رسالت ایک نہایت حساس معاملہ ہے اور اسے ایک ویڈیو فلم کی بنیاد پر طے کرنا شدید قسم کے جذبات پیدا کرسکتا ہے۔عجلت کے فیصلے ردّعمل کی نفسیات کو جنم دیں گے اور ریاست پھرنا کام ہوگی۔

* چوہدری اسلم اور راؤ انوار کہتے تھے کہ ملزم کو عدالت لے جائیں گے تو چھوٹ جائے گا لہٰذا ہزاروں لوگوں کو پولیس مقابلوں میں مار دیا گیا۔تب عمران خان کا اور ریاست کا سر شرم سے نہیں جھکا! کراچی میں ستر ہزار لاشیں بوری میں بند ملیں ریاست کا سر شرم سے نہیں جھکا!

* علماء کی جانب سے ریاستی پالیسی کی عجلت میں حمایت تشویش کا باعث ہے۔اس واقعے میں مدارس کا کوئی طالب علم شریک نہیں تو علماء کو وضاحتیں پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جس معاملے کی کلیت اور حقیقت واضح نہ ہو اس میں توقف ضروری ہوتا ہے۔

* لوگ ڈاکوؤں کو آگ میں جلا رہے تھے تب ریاست کو شرم نہیں آئی؟ عبدالستار ایدھی نے تیس ہزار لاوارث لاشوں کو دفنایا تو کسی کو شرم نہیں آئی؟ پاکستانی ریاست کا سر بھی شرم سے نہ جھک سکا؟ یہ لاوارث کہاں سے آ گئے؟ ریاست اور عبدالستار ایدھی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

* ۲۰۱۵ء میں لاہور کے یوحنا آباد میں عیسائیوں نے دو حافظ قرآن بھائیوں کو زندہ جلا دیا۔اس وقت پاکستانی قوم کا سر شرم میں کیوں نہیں جھک سکا؟ یہ سر کہاں رہ گیا تھا؟ یہ کبھی غائب ہو جاتا ہے اور کبھی حاضر ہو جاتا ہے۔اس سر کی حقیقت کیا ہے؟

* جاوید غامدی صاحب اپنے داماد کے ذریعے توہین رسالت کی سزا پر علماء کو مناظرے،

مکالمے کا چیلنج دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب نے ۲۰۰۶ء میں اپنی کتاب ''مقامات'' عربی اور انگریزی زبانوں میں شائع کرائی تھی وہ کتاب مارکیٹ سے کیوں غائب کرادی گئی؟ اس کتاب میں غامدی صاحب کی لنگڑی لولی انگریزی شاعری اور عربی انشاء پردازی کے نمونے موجود تھے۔ غامدی صاحب کے ۲۵ صفحات پر مشتمل عربی مضمون میں صَرف ونحو اور قواعد کی چھ سو اغلاط تھیں۔ جو شخص دیانت دار اور اہل نہ ہو اور دین پر کلام کرے وہ صرف لفّاظ ہے۔ لفّاظ سے کیا کلام کیا جائے؟ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسئلہ ماخذ سے نکلتا ہے۔ توہینِ رسالت کے مسئلے سے پہلے مآخذ دین پر بات ہوگی۔ مآخذ پر بات کیے بغیر کسی مسئلے پر گفتگو منطقی انجام تک نہیں پہنچ سکتی۔ جمہور علماء اور جمہور امت سنت رسول ﷺ کو دین کا بنیادی ماخذ سمجھتی ہے اور اجماعِ صحابہ واجماعِ امت کو حجت سمجھتی ہے۔ غامدی صاحب ان دونوں باتوں کو نہیں مانتے تو ان سے کیا بحث کی جائے؟

* سیالکوٹ کے واقعہ پر علماء کرام اور دینی جماعتیں اپنی سرپرستی میں آزادانہ تحقیقات کرائیں۔ ریاست اور میڈیا کے قائم کردہ کسی کمیشن کا اعتبار و انتظار کریں اور نہ ان پر اعتماد کریں۔ ریاستی اداروں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ریاستی مفادات یعنی عالمی مفادات کے تابع ہوتے ہیں۔ آسیہ ملعونہ کی رہائی اور حضرت ممتاز قادری شہیدؒ کی پھانسی اس کا ثبوت ہیں۔

مشال خان واقعے میں جو ریاستی کمیشن (JIT) بنایا گیا تھا اس نے جھوٹی رپوٹ تیار کی اور مشال خان کو بے گناہ قرار دیا تھا لیکن جماعت اسلامی نے جو تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا تھا اس کے نتائج بالکل مختلف تھے۔ غازی ممتاز شہید کی پھانسی کی تمام علماء نے مذمت کی اور تمام مسالک کے علماء شہید ممتاز قادریؒ کے جنازے میں شریک ہوئے۔ مشال خان کے مسئلے میں جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام نے گرفتار غازیوں کی بھرپور مالی، اخلاقی اور قانونی مدد کی تھی۔ ان کے حق میں جلوس بھی نکالے تھے اور جلسے بھی کیے تھے۔

سیالکوٹ میں توہین رسالت کے واقعے پر پورے ملک میں تبصرے ہو رہے ہیں لیکن ہم صورتِ حال واضح ہونے تک اپنا حتمی نقطۂ نظر پیش کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ میڈیا سے نشر ہونے والے واقعات، حادثات، ویڈیوز اطلاعات کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اسی میڈیا نے سوات میں عورتوں کو کوڑے مارنے کی ویڈیو جاری کی۔ بعد میں ثابت ہوا کہ یہ ویڈیو جعلی تھی۔ ایک NGO

نے صرف پیسے کمانے کے لیے تیار کی تھی۔ دو مہینے پہلے ایک ٹک ٹاکر عائشہ خان کے ساتھ مینار پاکستان پر ہونے والا حادثہ سب کو یاد ہوگا۔ عائشہ خان کی مظلومیت کی کہانی کا اصل پس منظر دو ہفتے بعد سامنے آیا تو اینکرز کو عائشہ کی حمایت کرنے پر عوام سے معذرت کرنا پڑی۔

لہٰذا ہماری سوچی سمجھی رائے فی الحال یہ ہے کہ علماء سیالکوٹ کے واقعہ پر اپنی سرپرستی میں فوراً آزادانہ تحقیقات کے لیے ایک کمیشن قائم کریں۔ تحقیق کرنے والے وہاں جا کر تمام لوگوں اور گرفتار شدگان سے ملاقات کریں اور اس معاملے کی اصل حقیقت شہادتوں کے ساتھ پیش کریں۔ کمیشن بتائے کہ فیکٹری کے تمام مزدور اچانک اس مینجر کے خلاف کیوں ہو گئے جو گیارہ سال سے کام کر رہا تھا؟ فیکٹری اور گردونواح کے تمام لوگوں اور ملزم قرار دیے گئے تمام کارکنوں کا انٹرویو کرے کہ کیا وجہ تھی کہ ملازمین اشتعال میں فیکٹری کو بھی جلانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے روزگار کی بھی پرواہ نہیں کر رہے تھے آخر کیوں؟ سرکاری، ریاستی، میڈیائی کمیشنوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ نہ ان کی ساکھ ہے اور نہ ان پر اعتبار و اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

مشال خان واقعہ میں جماعت اسلامی نے واقعہ کی حقیقت جاننے کے لیے کمیشن قائم کیا جس نے تصدیق کی کہ مشال مسلسل توہینِ رسالت اور توہینِ مذہب کا مرتکب ہو رہا تھا۔ جماعت اسلامی اور JUI نے غازیانِ رسالت مآب ﷺ کی مکمل قانونی، مالی، معاشی مدد کی، ان کے حق میں جلوس نکالے جبکہ سرکاری JIT نے مشال خان کو بے گناہ قرار دیا تھا۔ جماعت اسلامی نے اپنے کمیشن کی رپوٹ کے بعد مشال کو واصلِ جہنم کرنے والے غازیوں کی بھرپور حمایت کی۔

عمران خان، وکلاء، پولیس، عوام، شاتمانِ رسول اور غازیانِ شاتم کسی کو عدلیہ پر اعتماد نہیں ہے سب خود فیصلے کر رہے ہیں تو ایسے عدالتی نظام کو خدا حافظ کہہ دینا چاہیے۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل بھی کہہ رہی ہے کہ پولیس اور عدلیہ ملک کے کرپٹ ترین ادارے ہیں [جنگ ۸ دسمبر ۲۰۲۱ء] تو اس عدالت سے توہین رسالت کے مجرم رہا ہوتے ہی رہیں گے۔ عمران خان کو عدالتی نظام پر صرف اس وقت اعتماد کیوں نہیں ہوتا جب یہ عدالت توہین کے مقدمات میں تاخیر کرتی ہے۔ آخر کیوں؟

توہین رسالت کے مجرم کو کوئی قتل کر دے تو اسے قصاص میں قتل نہیں کیا جا سکتا یہ سنت رسول ﷺ سے ثابت ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ اس مسئلہ میں تواتر و تعامل سلطنت عثمانیہ اور مغلیہ سلطنت تک ثابت ہے۔

توہینِ رسالت ڈاکٹر محمد امین

قانونِ توہینِ رسالت کے حوالے سے

پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی-اسباب وعلاج

جاوید غامدی صاحب کا مؤقف انتہائی غلط ہے

مَیں نے جاوید احمد غامدی صاحب کی تقریر سنی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ توہینِ رسالت کا قانون خلافِ قرآن وسنت وفقہ ہے اور یہ قانون قرآن وسنت اور فقہ سے ثابت نہیں ہوتا، یہ ان پر مبنی نہیں ہے۔

یہ مؤقف جھوٹ اور علمی بددیانتی پر مبنی اور گمراہ کن ہے۔ میں نے جاوید صاحب کے ساتھ ۱۹۸۹ء میں ایک سال کام کیا۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، مل کر دینی کام کرنے کا موقعہ ملا۔ اس دوران مَیں نے ہمیشہ انہیں شستہ، سنجیدہ، باوقار، حلیم، بااخلاق اور مدلل گفتگو کرنے والا شخص پایا۔ مَیں حیران ہوں کہ انہوں نے یہ بیان کیسے دے دیا؟ یا تو وہ سٹھیا گئے ہیں یا نفسیاتی طور پر مغلوب الحال ہوگئے ہیں ورنہ کوئی عالم دین، جس کے ہوش وحواس قائم ہوں، یہ بیان کیسے دے سکتا ہے کہ پاکستان کا یہ قانون قرآن وحدیث وفقہ پر مبنی نہیں ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ جن مفسرین، محدثین اور فقہاء نے یہ مؤقف اپنایا ہے، یا جو اس وقت اس کے قائل ہیں وہ ان سے اختلاف کرتے ہیں، وہ ان کی رائے کو غلط سمجھتے ہیں لیکن یہ کہنا کہ توہین رسالت کی سزا قتل ہونا قرآن وسنت اور فقہ میں ہے ہی نہیں، یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یہ سفید جھوٹ نہیں سیاہ جھوٹ ہے اور جھوٹ سیاہ ہی ہوتا ہے۔ مَیں جاوید صاحب سے ایسے بیان کی توقع نہیں کرتا تھا۔ ۱۹۸۹ء میں میری ان سے حدیث وسنت کے حجت ہونے پر بحث ہوئی جو تلخی پر منتج ہوئی۔ مَیں اٹھ کر آ گیا اور دوبارہ کبھی ان سے نہیں ملا۔ مَیں ان کی آراء کو غلط سمجھتا تھا لیکن مَیں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی بے سروپا بات کہیں گے جس پر ان کی صداقت اور علمی دیانت سوالیہ نشان بن جائے اور اہلِ علم کے نزدیک مضحکہ خیز اور مسلم عوام الناس کے لیے اشتعال انگیز ہو۔

اسلام میں توہینِ رسالت کی سزا کے حوالے سے اُردو میں وسیع لٹریچر موجود ہے۔ عربی، انگریزی، مسلم معاشروں کی زبانوں اور بین الاقوامی زبانوں میں بھی اس پر لٹریچر موجود ہے۔

آسیہ مسیح اور غازی ممتاز قادریؒ کیس کے حوالے سے یہ موضوع ہمارے ہاں زیر بحث آیا اور اس پر دینی جرائد کے خصوصی نمبر اور بے شمار کتب شائع ہوئیں۔ البرہان کے کئی شماروں میں اس پر تفصیل سے لکھا گیا۔ شاتم رسول کی سزا کے حوالے سے ہمارا ایک کتابچہ بھی موجود ہے۔ البرہان کے موجودہ شمارے میں بھی اس موضوع پر کئی مضامین موجود ہیں۔ یہاں فی الحال صرف مذہبی انتہاء پسندی کے حوالے سے چند گزارشات نذرِ قارئین ہیں۔

جاوید احمد غامدی صاحب نے اپنی اس تقریر میں، جسے وزیر اعظم پاکستان جناب عمران خان نے اپنے انسٹا گرام میں شیئر کیا ہے، بتایا ہے کہ ان کی رائے میں پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کے تین بڑے اسباب ہیں:

۱۔ انتہا پسند دینی جماعتیں جیسے تحریک لبیک

۲۔ توہینِ رسالت کی سزا قتل ہونے کا قانون

۳۔ فوجی جنتا جو اپنے مقاصد کے لیے دینی گروہوں اور جماعتوں کو استعمال کرتی ہے۔

ہمیں ان کی رائے سے اختلاف ہے اور ہمارے نزدیک پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کے تین بڑے اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ مغربی ممالک اور ان کی خفیہ ایجنسیاں

۲۔ مسلم ممالک کے حکمران طبقات (فوج، سیاستدان، عدلیہ، بیوروکریسی)

۳۔ علماء کرام اور دینی جماعتیں

ہم نے جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ کوئی وقتی اور جذباتی رائے نہیں ہے اور نہ یہ غامدی صاحب کے ردّعمل میں وجود میں آئی ہے بلکہ یہ ہماری سوچی سمجھی اور برسوں پرانی رائے ہے جس کا ذکر ہم 'البرہان' میں کرتے رہتے ہیں اور البرہان کے باقاعدہ قارئین اس سے واقف ہیں۔ بہر حال ہم نے جن عوامل کو پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کا ذمہ دار قرار دیا ہے، ان کی کچھ تفصیل یہ ہے:

مغربی ممالک اور ان کی خفیہ ایجنسیوں کا کردار

عالم اسلام کی سطح پر دیکھیے تو یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ مغربی استعمار نے سازش سے

عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکایا اوران سے لڑایا۔ اور خود ترکی کے اندر اپنے حمایت یافتہ گروہ پیدا کیے خصوصاً ینگ ٹرکس (Young Turks)۔ انہیں عثمانی خلفاء سے لڑایا اوران کے ہاتھوں بالآخر عثمانی خلافت کا خاتمہ کرایا۔ اتاترک کے ہاتھوں اسلامی اقدار، روایات، شعائر کا خاتمہ کرایا اور اسلام پسند مسلمانوں کو کچلا اور دبایا۔ برصغیر کے تناظر میں جائزہ لیجیے تو انگریزی استعمار نے ہندوستان میں فرقہ واریت کا نہ صرف بیج بویا بلکہ اسے تن آور درخت بنایا۔ مسلم حکمرانوں کو شکست دینے کے لیے اس نے ہندوؤں کو ساتھ ملایا، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالی، مسلم جرنیلوں اور سیاستدانوں کو رشوتیں دیں اور سازشیں کیں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

اس نے اپنے حامیوں (جیسے سرسید احمد خاں اور امیر علی وغیرہ) کو تجدد کی راہ دکھائی، انہیں علماء کرام اور عامۃ المسلمین کے خلاف کھڑا کیا۔ غلام احمد قادیانی کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں میں نئی نبوت کھڑی کی اور مسلمانوں کی وحدت کو تار تار کرنے کی سازش کی۔ علامہ اقبالؒ نے جب قادیانیوں کے خلاف بیان دیا تو نہرو نے طنز کیا کہ ہم تو اقبال کو یورپ پلٹ روشن خیال مسلمان سمجھتے تھے، اس نے مسجد کے مولویوں جیسا بیان دیا ہے۔ اقبال نے فوراً جواب دیا کہ ہاں! میں اس میں متعصب ہوں کیونکہ یہ امت کی بقاء کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت حنفی تھی، استعمار نے انہیں اپنی سازشوں سے حنفی دیوبندی اور حنفی بریلوی میں تقسیم کر دیا اور دونوں میں نفرت اور تعصب کے بیج بوئے حالانکہ دیوبند حنفی علماء کا ایک مدرسہ تھا اور اسی طرح رائے بریلی میں مدرسہ منظر الاسلام بھی، لیکن انگریزی استعمار اور اس کی خفیہ ایجنسیوں نے دونوں کو آپس میں لڑایا، ایک دوسرے کے خلاف نفرت، حقارت اور تعصب پھیلایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو متحارب فرقے وجود میں آ گئے اور وہ آج بھی فروعی مسائل میں دست و گریبان ہیں۔

آج کل کے حالات دیکھیے تو مسلمان معاشروں اور ملکوں کو باہم لڑانے میں امریکی و یورپی استعمار کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے۔ معروف امریکی سیاستدان اور سابق وزیر خارجہ ہنری کلنٹن، برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلیئر اور روسی صدر پیوٹن علی الاعلان کہہ چکے ہیں کہ انتہا پسند اسلامی تنظیم 'داعش' امریکیوں نے بنوائی تھی۔ یہ حقیقت بھی طشت از بام ہو چکی ہے کہ امریکہ نے

عراق سے کویت پر حملہ کرایا تھا۔ پھر صدام حسین کو ایران سے لڑا دیا تاکہ ایرانی انقلاب کا خاتمہ ہو سکے اور عراق کمزور ہو جائے۔ پھر کیمیائی ہتھیاروں کا جھوٹا پروپیگنڈہ کر کے امریکہ نے عراق پر حملہ کر کے سنی صدام حکومت ختم کی اور وہاں شیعہ حکومت قائم کرائی۔ پھر شیعہ حکومت کے مظالم کے خلاف سلفیوں اور سنیوں کو متحد کر کے اور انہیں اسلحہ و تربیت دے کر داعش قائم کی۔ سی آئی اے نے ایران کو شیعی انقلاب برآمد کرنے کی شہ دی اور ایران نے شام اور یمن میں اہل تشیع کو اقتدار میں رکھنے اور لانے کے لیے مسلح مداخلت کی۔ یوں سی آئی اے کی کوششوں سے مشرق وسطیٰ مسلمانوں کا مقتل بن چکا ہے۔

مسلمان معاشروں کو اندر سے توڑنے، کمزور کرنے اور ان میں فرقہ واریت پھیلانے کے لیے بھی امریکی، یورپی اور اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ الاخوان المسلمون کو ناکام کر کے ان کے اندر سے اس نے جماعۃ الہجرہ والتکفیر بنوائی۔ پھر مرسی حکومت ختم کرنے کے لیے استعمار نے سعودی عرب کی مدد سے مصر کی سلفی جماعت کو الاخوان المسلمون کے خلاف کھڑا کیا۔ پاکستان میں امریکہ نے بھارت اور افغانستان اور ان کی خفیہ ایجنسیوں کی مدد سے تحریک طالبان پاکستان کھڑی کی۔ اسے ڈالر، اسلحہ اور تربیت دی اور اس نے نہ صرف پاکستان کی فوج کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی بلکہ پاکستان کے اندر مسلسل دہشت گرد کارروائیاں کر کے ملک کے امن و امان کو برباد کر کے رکھ دیا اور ہزاروں پاکستانی اس میں مارے گئے۔

یہ کوئی الف لیلہ کی داستان نہیں ہے، حقائق ہیں، اس پر بیسیوں کتابیں اور سیکڑوں ریسرچ آرٹیکلز دنیا میں چھپ چکے ہیں۔ ہم اس مضمون کو مختصر رکھنے کی خاطر اس تذکرے کو یہیں تک محدود رکھتے ہیں۔

پاکستان کے حکمران طبقات اور خفیہ ایجنسیوں کا کردار

پاکستان کے حکمران طبقات (سیاستدان، فوج، عدلیہ، بیوروکریسی) نے پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی پھیلانے میں جو کردار ادا کیا ہے، اس کی تین سطحیں ہیں: ایک شریعت نافذ نہ کرنے کی ضد۔ دوسرے فوج اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کا کردار۔ اور تیسرے دینی سیاسی جماعتوں اور مذہبی جماعتوں کو آپس میں لڑانا۔

شریعت نافذ نہ کرنا

پاکستان کے حکمران طبقات چونکہ مغرب زدہ ہیں۔ان کی تعلیم وتربیت کا اسلوب اور معیار ابھی تک تقریباً وہی چلا آرہا ہے جو برطانوی دور میں تھا۔مغربی طاقتوں اور اس کی خفیہ ایجنسیوں نے کوشش کی کہ پاکستان میں وہی لوگ برسر اقتدار آئیں جو ان کے تربیت یافتہ ہوں، ان کی تہذیب کے شائق ہوں اور اس تہذیب اور اس کی اقدار کو ہی پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہوں۔ چنانچہ پہلے دن سے اس نے یہ طے کرلیا کہ کسی ایسی دینی جماعت کو اقتدار میں نہیں آنے دینا (اور یہ صرف پاکستان میں ہی اس نے سارے اسلامی ممالک میں میں کیا۔الجزائر میں اسلامی تحریک انتخابات میں کامیاب ہوگئی، اسے اقتدار منتقل نہیں کیا گیا اور اسے فوج کے ذریعے کچل دیا گیا۔ یہی کام مصر میں الاخوان المسلمون کی کامیابی کے بعد صدر مرسی کے ساتھ کیا گیا اور فلسطین میں انتخابات میں کامیابی کے بعد حماس کو فلسطین میں حکومت نہیں بنانے دی گئی اور وہ غزہ تک محدود ہو کررہ گئی) جو شریعت نافذ کرنے پر اصرار کرے۔حکمران طبقات کی اس ضد نے دینی قوتوں میں ردِّعمل پیدا کیا۔اگرچہ مین سٹریم کی سیاسی جماعتوں نے ابھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن کئی چھوٹی دینی جماعتوں اور گروہوں نے تشدد کا راستہ اپنایا ہے جیسے لال مسجد کے لوگ، تحریک طالبان پاکستان، صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت محمدی، جہادی تحریکیں اور حزب التحریر وغیرہ۔

فوج کا کردار

فوج نے جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق اور جنرل مشرف کے ادوار میں طویل عرصہ تک حکومت کی اور چونکہ سیاسی جماعتوں کی طرح اس کی جڑیں عوام میں نہیں ہوتیں للہذا مجبوراً اسے Maneuvering کرنا پڑتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ جنرل ضیاء نے کراچی سے جماعت اسلامی (اور جمعیت علماء پاکستان) کا زور توڑنے کے لیے ایم کیوایم بنوائی، اسی طرح سرحد پار کارروائیوں کے لیے لشکر طیبہ/ جماعۃ الدعوہ بنوائی گئی اور اب سیاسی جماعتوں کو کنٹرول کرنے کے لیے تحریک لبیک وجود میں لائی گئی ہے۔ٹی ٹی پی کو اگرچہ کنٹرول امریکہ اور بھارت کررہے تھے تاہم خفیہ ایجنسیوں کو بعض اوقات دونوں طرف کام کرنا پڑتا ہے جیسے ٹی ٹی پی نے مزارات اور امام بارگاہوں پر حملے کرکے بریلوی اور شیعہ گروپوں کو مشتعل کیا اور پشاور سکول پر حملے نے فوج کے

سویلین حکومت پر بالا دستی دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔

دینی سیاسی جماعتوں کو باہم لڑانا

پاکستان بننے کے بعد مغربی خفیہ ایجنسیوں کے ایماء پر پاکستان کے گماشتہ حکمرانوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں نے دینی جماعتوں کو آپس میں لڑایا تا کہ وہ باہمی لڑائی اور سر پھٹول میں پڑ کر کمزور ہو جائیں اور سیکولر سیاسی جماعتوں اور حکمرانوں کے لیے خطرہ نہ رہیں۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد جب جماعت اسلامی نے اسلامی دستور کی مہم شروع کی تو پہلے اس کے خلاف جمعیت علماء اسلام کے حنفی دیوبندی علماء کو فعال کیا۔ پھر بریلوی علماء کو متحرک کر کے اور انہیں دیوبندی علماء کا ہوّا دکھا کر ان سے جمعیت علماء پاکستان بنوائی۔ پھر اہل حدیث علماء کو سمجھایا کہ قرآن وسنت کے داعی اور موحّد تو تم ہو، یہ گستاخانِ رسول تو اسمبلی کی تو ساری نشستیں لے جائیں گے، چنانچہ اہل حدیثوں کی سیاسی جماعت بن گئی۔ پھر خفیہ ایجنسیوں نے انتخابات میں ان سب کو ایک دوسرے کے خلاف لڑایا اور ان کی خوب ہوا خیزی ہوئی۔ بار بار اس عمل سے گزرنے کے بعد دینی سیاسی جماعتیں کمزور ہو گئیں، ان کا ووٹ بنک کم ہوتا گیا اور اب وہ بمشکل چند نشستیں ہی جیت سکتی ہیں۔

پھر حکمران طبقوں اور خفیہ ایجنسیوں نے ان دینی سیاسی جماعتوں کے اندر بھی توڑ پھوڑ کی اور ہر جماعت کے اندر کئی دھڑے بن گئے۔ جمعیت علماء پاکستان کے اندر اتنے دھڑے بنے کہ وہ ختم ہی ہو گئی اور اس کی اسمبلی میں کوئی نشست نہیں ہے۔ اہل حدیث بھائیوں کی تعداد پاکستان میں مسلکی لحاظ سے بہت کم ہے لیکن سب سے زیادہ مذہبی دھڑے ان میں ہیں جو ان کو کمزور کرنے اور ناکام بنانے میں کامیاب کردار ادا کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی اور فضل الرحمن صاحب کی جماعت کے بھی کئی دھڑے وجود میں آ چکے ہیں لیکن ابھی ان میں تھوڑی سی جان باقی ہے اور وہ قبائلی پٹی سے چند نشستیں جیتنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جماعت اسلامی کی سٹریٹ پاور بہت کمزور اور ووٹ بنک تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

دینی قوتوں میں فرقہ واریت کے بیج بونے میں حکومتی اداروں اور ان کی وضع کردہ مخصوص پالیسیوں کا بڑا کردار ہے مثلاً کوئی مسجد نہیں بن سکتی جب تک وہ اپنا مسلک ڈیکلیئر نہ کرے۔ حکومت نے دینی مدارس کے پانچ مسلکوں کے پانچ امتحانی بورڈز کی منظوری دی (حالانکہ اگر وہ

چاہتی تو دینی یکجہتی کے لیے ایک بورڈ بھی بن سکتا تھا)۔ پھر ان بورڈز کو مزید کمزور کرنے کے لیے انہی مسلکوں کے دس مزید امتحانی بورڈز بنا دیے گئے۔ اسی طرح ہر مسلک کی سیاسی جماعت کو الیکشن کمیشن نے بآسانی رجسٹر کر لیا حالانکہ حکومت فرقہ واریت کو فروغ پانے سے روکنے کے لیے ہر مسلک کی سیاسی جماعت بنانے کے خلاف قانون بنا سکتی تھی لیکن کسی حکومت نے ایسی کوشش نہیں کی اور نہ مساجد اور دینی مدارس کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر کام کرنے سے روکنے کے لیے کوئی اقدام کبھی کیا۔ ہمارے حکمرانوں کی تو یہ حالت ہے کہ اوقاف کے محکموں میں تقرریاں مسلک کی اساس پر ہوتی ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت میں تقرریوں میں بھی مسالک کا خیال رکھا جاتا ہے۔ حکومت جب علماء سے بات کرنا چاہے، انہیں کسی صوبائی یا قومی کانفرنس میں بلانا چاہے تو بھی مسالک کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

ان سب باتوں کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان کے حکمران طبقات کا ملک میں فرقہ واریت اور مذہبی انتہا پسندی کو فروغ دینے میں بہت بڑا کردار ہے۔

علماء کرام اور دینی جماعتوں کا کردار

بلاشبہ مذہبی انتہا پسندی میں علماء کرام اور دینی جماعتوں کا کردار سب سے زیادہ ہے۔ اگر ہمارا یہ تجزیہ صحیح ہو، جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں عرض کیا ہے، کہ ہمارے ہاں فرقہ واریت اور مذہبی انتہا پسندی کو فروغ دینے میں مغربی استعمار اور اس کی سازشوں اور ہمارے مغرب زدہ حکمرانوں اور حکمران طبقات کا ہاتھ ہے تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری دینی جماعتیں اور علماء کرام کیا فہم وفراست سے عاری ہیں کہ انہیں یہ سب نظر نہیں آتا یا وہ اخلاص سے محروم ہیں کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ مسلک پرستی، فرقہ واریت اور مذہبی انتہا پسندی کے لیے کام کر رہے ہیں اور اس کے تدارک کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ ہم یہ بات دینی عناصر کے فہیم عناصر پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس کا فیصلہ کریں۔ تاہم جو چیزیں صاف سطح پر نظر آ رہی ہیں وہ یہ ہیں کہ ہماری مساجد فرقہ واریت کا گڑھ ہیں اور ہمارے دینی مدارس اپنے اپنے مسلک کے سپاہی اور مرید تیار کرتے ہیں۔ ہماری اصلاحی وتبلیغی جماعتیں بھی مسلک پرستی اور فرقہ واریت پر مبنی ہیں اور دینی سیاسی جماعتیں بھی۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۲)

پاکستانیات ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

پاکستان کی معاشی تباہی۔حل موجود ہے

کوئی اس پر غور تو کرے!

متبادل حکمت عملی یہ ہے کہ آئی ایم ایف سے معاہدہ ختم کر دیا جائے، بیرونی قرضوں اور سودی ادائیگیوں کو مؤخر کر دیا جائے اور سرمایہ دارانہ نظام کے چنگل سے نکل کر اسلامی اور روایتی بلا سود معیشت کو ملک میں فروغ دیا جائے

عمران خان اگر ملک کو مغرب کی معاشی، سیاسی اور فکری غلامی سے نہیں نکالنا چاہتے تو 'تبدیلی'، 'نیا پاکستان' اور 'ریاست مدینہ' کے نعرے ترک کر دیں۔ اپنی ناکامیوں کے سبب تاریخ کی نذر تو وہ ویسے بھی ہونے ہی والے ہیں۔

اگر عمران خان یہ سب کچھ عمداً اور مغرب کی ڈکٹیشن پر کر رہے ہیں تو ان کے مخالفین کے اس الزام میں وزن ہوگا جو انہیں مغرب اور یہودیوں کا ایجنٹ کہتے ہیں۔ اگر چہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اکثر سابقہ حکمران بھی ایسے ہی تھے۔

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب نے جو ملک کے معروف ماہر معیشت اور اسلامی نظام معیشت کے علمبردار ہیں، یہ مضمون ۲۰۱۹ء میں لکھا تھا جب آئی ایم ایف کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا۔ موجودہ ابتر معاشی حالات اور بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ڈاکٹر صاحب کے خدشات کو سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ مذکورہ تحریر معمولی ایڈیٹنگ کے بعد نذرِ قارئین ہے۔ مدیر

یہ مضمون اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرے گا اور ثابت کرے گا کہ آئی ایم ایف سے معاہدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور اس کا فی الفور منسوخ کیا جانا اور متبادل حکمت عملی اختیار کرنا بالکل ممکن ہے۔

آئی ایم ایف سے معاہدہ کی تفصیل

اس پروگرام کے تحت پاکستان کو 39 مہینوں میں (جو ۲۰-۲۰۱۹ء سے شروع ہو کر ۲۴-۲۰۲۳ء تک) 6 بلین ڈالر اپنے EFF منصوبہ کے تحت قرض دے گا۔ EFF پروگراموں

کا اصل مقصد ان ممالک کو، جنہیں یہ سہولت فراہم کی جارہی ہے، اس قابل بنانا ہوتا ہے کہ وہ اپنی بین الاقوامی سودی اور اصلی قرضہ جاتی ادائیگیاں بروقت ادا کرتے رہیں۔لیکن اس اصل مقصد کے لئے جو توجیح بیان کی جاتی ہے اس کے مطابق قرضہ حاصل کرنے والے ممالک بیرونی قرضہ جاتی صلاحیت کے حصول کے ساتھ ساتھ اس حکمت عملی کو اپنا کر اپنے ملک کو مستحکم ترقی (stabilized growth) کی راہ پر گامزن کردیتے ہیں۔

عملاً ایسا کبھی نہیں ہوتا۔بیشتر EFF پروگرام ان معنوں میں کامیاب رہے ہیں کہ قرض حاصل کرنے والے ممالک بین الاقوامی سود اور اصل تو پروگرام کے دوران ادا کرتے رہے لیکن ان کے مجموعی بین الاقوامی قرضہ جات اور ادائیگیوں کی ذمہ داریوں میں کمی آئی نہ ان میں مستحکم ترقی رونما ہوئی۔سب سے واضح مثال یونان کی ہے جس کو 2015ء میں ایک بہت بڑا پروگرام دیا گیا۔2016 تا 2019ء وہاں کی اوسط شرح نمو 1.5 فیصد رہی اور ملک کے بین الاقوامی واجبات جوں کے توں ہیں۔پاکستان بھی متعدد EFF پروگراموں کی ناکامی کا شکار ہو چکا ہے۔لیکن چونکہ ان پروگراموں کا اصل مقصد مقروض ممالک کی بین الاقوامی واجبات کی مستقل ادائیگی ہے جو پورا ہو رہا ہے اس لیے آئی ایم ایف مستحکم ترقی کا جھانسہ دیئے چلا جارہا ہے اور اس وقت دنیا کے 37 غریب ممالک EFF کے فریب میں پھنسے ہوئے ہیں۔

مستحکم ترقی کو یوں مہمیز دینے کے یہ دعوے جن معاشی نظریات کی بنیاد پر قائم ہیں انہیں ووڈو اکنامکس (Voodoo Economics) کہتے ہیں۔ایک نوبل انعام یافتہ معیشت دان جوزف سٹیگلٹز (Joseph stiglitz) کہتا ہے کہ ووڈو اکنامکس پر بہترین یونیورسٹیوں کے بدترین طالب علم ایمان لاتے ہیں اور یہی آئی ایم ایف کا معاملہ ہے۔

ووڈو اکنامکس کا کلیدی مفروضہ یہ ہے کہ معاشی عدم استحکام کا اصل سبب حکومتی بجٹ خسارہ میں اضافہ ہے۔یہ بات اصلاً غلط ہے۔۲۰۰۸۔۲۰۰۹ء میں یورپ اور امریکہ میں جو قرضہ جاتی بحران آیا تھا اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے یورپی اور امریکی حکومتوں نے کئی سال تک اپنے بجٹ خسارہ میں بے تحاشہ اضافہ کیا اور حکومتی شرح سود تقریباً صفر کردی تھی اور اس دوران یہ حکومتیں اپنے دفاعی اخراجات میں ہوشربا اضافہ بجٹ خسارہ کو بڑھا کر کرتی رہیں۔EFF جیسا پروگرام بھارت، چین، امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور جاپان کہیں بھی نہیں اپنایا گیا حالانکہ ان سب

ممالک کے بین الاقوامی قرضہ جاتی واجبات مستقل بڑھ رہے ہیں، عالمی شرح نمو(GDP Growth Rate) خود آئی ایم ایف کے حالیہ تخمینوں کے مطابق گر رہی ہے اور ۲۰۱۹ء میں یورپ اور امریکہ میں ۲ فیصد ہونے کی توقع ہے۔

لیکن پاکستان کے تمام معاشی ماہرین خواہ لبرل ہوں یا اشتراکی، سوشل ڈیموکریٹ ہوں یا اسلامسٹ سب کے سب وڈو اکنامکس پر ایمان لے آئے ہیں۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ان میں بیشتر تو سامراج کے مراعات یافتہ ہیں جنہوں نے دانستہ اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں لیکن ایک قلیل اقلیت ان کی بھی ہے جو اکنامکس کے جاہلی منہج کو غیر اقداری (Value Neutral) کہتے ہیں اور کسی دوسرے (یعنی اسلامی) منہج علمیت کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جاہلی علمیت کو معقول تصور کرنا اسلامی پالیسی سازی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

آئی ایم ایف کا معاہدہ پیشگی شرائط کو پورا کرنے پر روبہ عمل آئے گا۔ یہ پیشگی (Precondition) مطالبات ۲۰۱۹-۲۰ء کے بجٹ میں پورے کر دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ آئی ایم ایف کے منظور نظر حفیظ شیخ (بعد میں شوکت ترین) اور باقر رضا کو معاہدہ کی تنفیذ کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے۔ اس بجٹ میں وہ حکومتی خسارہ جو سودی اور اصلی ادائیگیوں کے علاوہ ہے، کم ہوا ہے۔ بیرونی اصل اور سود کی ادائیگیاں ۲۰۱۸-۲۰۱۹ء میں 1234 بلین روپے سے بڑھ کر ۲۰۱۹-۲۰ء میں 1455 بلین ہونے کی توقع ہے اور روپے کی ڈی ویلیویشن (devaluation) یقیناً اس سے زیادہ ہو جائے گی۔ بجٹ میں توانائی کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ کی 'نوید' سنائی گئی ہے اور بجلی کے نرخ ہر تین مہینہ بعد بڑھائے جائیں گے۔

آئی ایم ایف معاہدہ کے تحت جو محصولات کا شیڈول دیا گیا ہے اس کے مطابق ۲۰۱۹-۲۰ء میں 1056 بلین کے اضافی ٹیکس لگائے جائیں گے۔ اگلے سال 1500 بلین کے اضافی ٹیکس لگائے جائیں گے اور 2021-2022ء میں مزید 1500 کے ٹیکس لگائے جائیں گے۔

بالواسطہ(indirect) اضافی ٹیکسوں کا بیشتر بوجھ غریبوں پر پڑے گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بالواسطہ ٹیکسوں میں ۲۰۱۹-۲۰۱۸ء کے مقابلہ میں 14 فیصد کا اضافہ ۲۰۱۹-۲۰ء کے بجٹ میں کیا گیا ہے جو ۲۰۱۹-۲۰ء کی مجموعی FBR محصولات کا 63 فیصد بنتے ہیں۔بلاواسطہ (direct) ٹیکسوں کا حصہ مجموعی FBR میں ۲۰۱۸-۱۹ء کے 40 فیصد سے کم کر کے 37 فیصد ۲۰۱۹-۲۰ء کے تخمینوں میں کر دیا گیا ہے۔کارپوریشنوں اور بینکوں کی آمدنی اور منافع پر ٹیکس کی شرح کم کردی گئی ہے۔سرمایہ جاتی اثاثہ پر ٹیکس(capital value tax)۲۰۱۸-۱۹ء میں FBR کے مجموعی محصولات کا 0.08 فیصد تھا اور ۲۰۱۹-۲۰ء میں 0.07 ہوگا۔

آئی ایم ایف کے پروگرام کے دورانیہ میں پاکستان کو اپنے بیرونی قرضہ دینے والوں کو 37 ہزار بلین روپے ادا کرنا ہوں گے اور توقع ہے کہ پروگرام کے دوران پاکستان کو 38 ہزار بلین کے مزید قرضہ جات بیرونی ذرائع سے حاصل ہوں گے۔ظاہر ہے کہ آئی ایم ایف خود تو صرف 942 بلین روپے کے لگ بھگ (یعنی 6 بلین ڈالر) کے قرضہ دے گا جس میں تقریباً 710 بلین روپے(یعنی 5.4 بلین) پاکستان آئی ایم ایف کو پروگرام کے دورانیہ ہی میں واپس کردے گا اور پاکستان کو اصلاً صرف 5.1 بلین ڈالر حاصل ہوں گے۔باقی تمام رقوم بین الاقوامی سودی بینکوں، سٹہ بازاروں، ورلڈ بینک اور سرمایہ دارانہ ممالک سے بھیک مانگ کر حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہ پروگرام پاکستان کو اس کی خود مختار حاکیت(Sovereignty) سے محروم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔۲۰۲۰-۱۹ء سے ۲۰۲۳-۲۴ء تک کی مالی (Financial)اور مالیاتی (Monetary) پالیسیاں آئی ایم ایف کے زیر سایہ متعین ہوں گی۔پروگرام کا اجراء اس بات پر منحصر ہے کہ ہم عالمی دہشت گردفائنینسنگ ادارہ(FATF) کی بالادستی قبول کریں اور سامراجی ممالک کو ناراض نہ کریں ورنہ معاہدہ فوراً منسوخ کر دیا جائے گا جیسے اس وقت کہا گیا تھا جب ہم نے ۱۹۹۸ء میں نیوکلیئر تجربات کیے تھے۔

۱۹۹۹ء میں کیا ہوا

۱۹۹۷ء میں اپنی حکومت قائم کرنے کے کچھ عرصہ بعد نواز شریف نے آئی ایم ایف سے اسی قسم کا ایک تین سالہ EFF معاہدہ کیا تھا جس کا دورانیہ 2001ء تک تھا لیکن جیسے ہی ہم نے

1999 میں ایٹمی دھماکے کیے آئی ایم ایف نے اپنی روایتی منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ معاہدہ ختم کردیا۔اور امریکہ نے ہم پر پابندیاں لگادیں۔2000-1999ء ہمیں آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، اسلامی ترقیاتی بینک اور سامراجی ممالک سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا، الٹا ہم نے 6 بلین ڈالر واجبات کی شکل میں ان سامراجی اداروں کو ادا کیے۔اس سال ہماری GDP کی شرح نمو 5 فیصد رہی۔تمام ادائیگیاں سرکاری ملکی بچتوں سے کی گئیں اور افراطِ زر (Inflation) کا نام ونشان نہیں دیکھا گیا اور روپیہ کی بین الاقوامی قیمت (Exchange Rate) میں اضافہ ہوا۔

آئی ایم ایف سے معاہدہ کی کوئی ضرورت نہیں

اس معاہدہ کے تحت ہمیں آئندہ تین سال تین مہینوں میں 6 بلین نہیں صرف ڈیڑھ بلین اضافی ڈالر ملیں گے یعنی 285 بلین روپیہ اور وہ بھی اس شرط پر کہ ہر تین مہینہ بعد آئی ایم ایف سے ہماری معاشی پالیسیوں کی جانچ پڑتال کے بعد تصدیق کرے کہ پاکستان مستعدی سے آئی ایم ایف اور سامراج کی غلامی کررہا ہے۔۲۰-۲۰۱۹ء میں پاکستان میں مجموعی سرمایہ کاری کا حجم تقریباً 6000 بلین کا تھا اور اس سال اس کی رفتار نمو تقریباً 3 فیصد رہی۔۲۰۱۹-۲۰۰۰ء کے دورانیہ میں مجموعی سرمایہ کاری کی رفتار نمو سالانہ اوسطاً 6.15 فیصد رہی۔اگر آئندہ تین سالوں میں سرمایہ کاری کی رفتار نمو اوسطاً تین فیصد رہی تو اس دوران مجموعی سرمایہ کاری کا حجم 915:18 بلین ہوجائے گا۔اگر آئندہ تین سالوں میں مجموعی سرمایہ کاری کی سالانہ اوسط رفتار نمو 6.15 فیصد رہی تو تین سالہ دورانیہ میں پاکستان میں عمومی سرمایہ کاری کا حجم 203.24 بلین روپے ہوگا۔

یادرہے کہ اس دورانیہ میں آئی ایم ایف سے ملنے والا قرضہ صرف 285 بلین روپے ہے اور اگر سرمایہ کاری کی اس دوران رفتار نمو 3 فیصد رہی تو یہ مجموعی سرمایہ کاری کا 0.015 فیصد بنتا ہے۔اگر رفتار نمو 6.15 فیصد رہی تو آئی ایم ایف سے حاصل شدہ رقوم اس دورانیہ کی سرمایہ کاری کا صرف 0.01 بنتی ہیں۔اس 0.01 فیصد کے عوض ہم نے قومی خودمختاری کو سامراج کے ہاتھ فروخت کردیا ہے۔

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

پھر یہ 285 بلین روپے سارے کے سارے سامراجی سودخوروں کے پیٹ بھرنے کے لئے استعمال کئے جائیں گے اور ان میں سے ایک پیسہ بھی ملکی معیشت کی "مستحکم ترقی"

(stabilized growth) کوفروغ دینے کے لئے خرچ نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک خود کفیل معیشت ہیں اور ہمیں نہ بیرونی سرمایہ کاری کی ضرورت ہے، نہ سامراجی سود اور سٹہ کے بازاروں سے قرض لینے کی اور نہ سامراجیوں سے بھیک مانگنے کی۔ بیرونی سرمایہ کاری کا حجم 2019۔2000ء کے دورانیہ میں سالانہ اوسطاً 190 بلین رہا ہے جو اوسطاً مجموعی سرمایہ کاری کا 3 فیصد بنتا ہے اور 97 فیصد سرمایہ کاری ہر سال ملک میں اندرونی ذرائع سے کی جاتی ہے۔ پاکستان میں تیار کئے ہوئے مال میں سے ایک سال میں اوسطاً صرف 8 فیصد ایسا ہے جو برآمد کیا جاتا ہے، 92 فیصد مال ملکی استعمال میں آتا ہے۔ درآمدات مستقل گر رہی ہے اور اس کا مثبت اثر ملکی معیشت پر پڑ رہا ہے کیونکہ ملکی پیداوار درآمدات کی جگہ لینے کی سکت رکھتی ہے 19۔2018ء میں ہمیں مجموعی طور پر سامراج سے جو قرضہ جات اور بھیک ملی اس کا حجم 6 بلین ڈالر (یعنی 1403 بلین روپے) تھا، اس کے برعکس 19۔2018ء میں ہم نے سامراج کو 2673 بلین سود اور اصل کے شکل میں واپس کیے۔ یعنی (2673۔1403) 1203 بلین روپے سامراج نے ہم سے کمائے۔ کیا پھر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ سامراجی بھیک اور قرضہ جات ہمارے لئے مفید ہیں؟

اسلامی انقلابی متبادل

سامراج کے کاسہ لیس اور ان کے 'معصوم' حاشیہ برداراس سامراجی بھیک اور قرضوں کو مفید کہے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سامراج کے یہ لے پالک دھڑا دھڑ پیسہ عالمی سود اور سٹہ کے بازاروں میں منتقل کئے جا رہے ہیں۔ آئی ایم ایف سے معاہدہ کی حمایت کر کے ملک کی تمام سیکولر جماعتیں ثابت کر رہی ہیں کہ وہ پاکستانی قوم کی غدار ہیں اور اسے تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہیں۔ ہم ان کی چالوں سے بخوبی واقف ہیں اور آئی ایم ایف سے اس معاہدہ اور اس مروجہ معاشی حکمت عملی کو رڈ کرتے ہیں۔

سیکولر اور لبرل ماہرین معیشت لوگوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ مغرب کی یہ معاشی غلامی ہماری مجبوری ہے اور اس کے بغیر ملک نہیں چلایا جا سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔ اگر کوئی حکمران ذرا بھی اسلامی یا قومی حمیت رکھتا ہو اور مغرب کی غلامی سے بچنا چاہتا ہو تو متبادل حکمت عملی یہ ہے:

پاکستان کے تقریباً 80 بلین ڈالر بیرونی واجبات کی ادائیگیوں پر فی الفور پابندی (moratorium) لگا دی جائے اور سامراجی اداروں، حکومتوں اور بینکوں سے وسیع پیمانہ پر مذاکرات کا آغاز کر دیا جائے جیسا کہ حال ہی میں کئی لاطینی امریکی ممالک (ایکوڈور، بولیویا، وینزویلا، پیرو اور یوروگوائے) اور ماضی میں مصر و تیونس نے کیا ہے۔ان مذاکرات کے ذریعہ ان ممالک کی بین الاقوامی ادائیگیوں میں تمام تخفیف کی گئی، ادائیگیوں کا توسیع شدہ دورانیہ مقرر کیا گیا، ادائیگیوں کو مقروض ملک کی برآمدات سے حاصل شدہ رقوم سے وابستہ کیا گیا اور ایسے تمام معاہدے آئی ایم ایف کی مرضی کے باوجود کیے گئے۔یہ معاہدے اس بات کے باوجود ہوئے کہ بولیویا اور ایکوڈور میں سامراج مخالف حکومتیں برسراقتدار ہیں (بلکہ وینزویلا نے تو یک طرفہ کاروائی کی ہے)۔لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم مغرب کو اس قسم کا معاہدہ کرنے پر مجبور نہ کر دیں جو واجب الادا سود کی ادائیگی ہمیشہ کے لیے ختم کر دے، واجب الادا اصل کی ادائیگی کو ہماری برآمدات کی آمدنی سے منسلک کر دے اور واجب الادا ادائیگیوں کا ایک لچکدار طویل المدت دورانیہ (Schedule) مقرر کیا جائے۔

سامراج کے لیے اس قسم کا معاہدہ کرنا مشکل نہیں کیونکہ پاکستان میں اس کی لگائی ہوئی رقوم عالمی سرمایہ کاری کا 0.0002 فیصد ہے اور ہماری ادائیگیوں سے محرومی عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو کسی خطرہ سے دوچار نہیں کرے گی۔جن لاطینی امریکی ممالک سے اس قسم کے معاہدے کیے گئے ان کے بین الاقوامی واجبات پاکستان سے سات گنا زیادہ ہیں، لیکن فرض کیجئے کہ سامراج اس قسم کے کسی معاہدہ پر تیار نہیں ہوتا تو کیا ہوگا؟ کیا اس کی وجہ سے امریکہ ہم پر حملہ کر کے چین کے ساتھ تیسری جنگ عظیم چھیڑ دے گا۔سرمایہ داری کی چھ سو سالہ تاریخ میں کبھی بھی مقروض ممالک سے واجبات کے حصول کے لئے جنگ نہیں لڑی گئی اور اس حماقت کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔زیادہ سے زیادہ ہم پر مالیاتی پابندیاں عائد کر دی جائیں گی جیسا کہ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں جب ہم نے نیوکلیئر دھماکہ کیا تھا تو ہم پر لگائی گئی تھیں لیکن سطور بالا میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس عمل سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ فائدہ ہی ہوا۔اس سال مجموعی آمدنی کی شرح نمو 5 فیصد رہی۔حال ہی میں برادر ملک اسلامی جمہوریہ ایران پر سخت ترین مالیاتی پابندیاں لگائی گئیں لیکن اس کے باوجود پچھلے 5 سال سے اس کی معیشت 6 فیصد اوسط کی رفتار سے

ترقی کررہی ہے۔ ہم نے سطور بالا میں یہ بھی دیکھا کہ ملک میں 93 فیصد سرمایہ کاری اندرونی ذرائع سے ہوتی ہے اور پیداوار کا 90 فیصد سے زیادہ حصہ یہیں فروخت کیا جاتا ہے گویا ہماری معیشت بین الاقوامی تجارت پر منحصر ہے اور نہ بین الاقوامی سودی اور سٹہ کے بازاروں پر۔

اگر ہم پر مالیاتی پابندیاں عائد کی جاتیں تو ہم 2020-2019ء میں وہ 1400 بلین روپے جو بیرونی سود اور اصل کی ادائیگیوں کے لئے وقف کئے گئے تھے، ادا کرنے سے انکار کردیتے اور یہ پیسہ بھی ملک میں زراعت، صنعت، تعلیم اور صحت کے فروغ کے لئے استعمال کیا جاتا۔

ہماری حکومت Documentation اور چھوٹے اور اوسط درجہ کے کاروبار پر نگرانی اور تادیب کی مہمات کو فی الفور منسوخ کردیتی۔ Documentation کے ذریعہ سامراجی ہماری معیشت کو سود اور سٹہ کے بازاروں میں جکڑ دینا چاہتے ہیں اور حلال رزق کی فراہمی کو مشکل سے مشکل بنادینا چاہتے ہیں یہ اس لئے کہ وہ اسلام دشمن ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمارے روایتی بازار اور کاروباری حلقے اسلامی نظام معیشت کا ہراول دستہ ثابت ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ہم تمام بینکوں اور مالی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیتے اور زر(M1,M2,M3) کے نظام اجرا اور تخفیف میں بنیادی تبدیلی لاکر اسٹیٹ بینک مارکیٹ بیسڈ مانیٹری پالیسی (Market based Monitory Policy) ختم کرکے Credit Planning کے اس نظام کو دوبارہ قائم کردیتے جو 1975 سے 1989ء تک ملک میں نہایت کامیابی سے چلتا رہا ہے۔ اسٹیٹ بینک کے تمام ماتحتانہ تعلقات آئی ایم ایف اور دیگر سامراجی فائننشل اداروں سے منقطع کردیتے۔

ہم روپے کا غیر ملکی کرنسی میں شرح تبادلہ (Exchange Rate) محدود کردیتے۔ ہم اندرونی و بیرونی زر (Foreign Currency Market) کو ختم کردیتے اور Foreign Currency کے اجرا کی ذمہ داری سرکار کو سونپ دی جاتی جیسا کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۸ء تک تھا۔

ہم بیرونی ترسیل زر پر سخت پابندیاں عائد کرتے اور اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کرتے کہ پاکستان سے دولت غیر ممالک منتقل کئے جانے کے تمام دروازے یکسر بند کردیے جائیں۔ ہم تمام بیرونی قرضہ جات اور بھیک کی وصولی پر پابندی لگادیتے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۷۶)

خود نوشت مدیر

مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا؟ (۷)

موت کی خوشبو

* مَیں نے ایم ایم عالم (مرحوم) سے پوچھا جب ہم کراچی میں ان کے گھر [۱] میں بیٹھے تھے۔ (جب مَیں اور سراج [۲] ان کے ہاں پہنچے تو وہ چار پائی پر بیٹھے تھے اور انہوں نے گرم اونی شال اوڑھ رکھی تھی) [۳] کہ جب آپ بھارتی پائلٹ سے فضا میں دو بدو جنگ لڑ رہے تھے تو آپ کو ڈر نہیں لگا کہ آپ بھی ہٹ ہو سکتے ہیں اور ایک لمحے میں آپ کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟

وہ کہنے لگے امین صاحب! جب مَیں پہلی دفعہ بحیثیت فائٹر پائلٹ اپنی سیٹ پر جہاز اڑانے کے لیے بیٹھا اور دشمن کے جہاز فضا میں موجود تھے، تو مَیں نے سوچا کہ یہ میری آخری اڑان ہو سکتی ہے۔ تو مَیں مسلمان ہوں، مَیں نے آنکھیں بند کیں، تصور کیا کہ میرے پرخچے اُڑ رہے ہیں تو مَیں نے موت کی خوشبو سونگھ لی۔ مَیں نے کلمہ پڑھا اور جہاز کا گیئر دبا دیا۔ پھر مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔

* میرا نفس طویل برسوں تک فجر کی نماز سے پہلے اٹھنے پر میری مزاحمت کرتا رہا۔ مَیں نے اور میرے مربی نے بہت زور مارا لیکن بات نہ بنی۔ پچھلے رمضان میں جب مجھے کورونا ہوا اور ایک وقت آیا جب مَیں ہسپتال میں تھا، سانس لینے میں دقت تھی، آکسیجن لگی ہوئی تھی تو ڈاکٹر نے

---

[۱] ایم ایم عالم صاحب کا کوئی گھر نہ تھا، وہ اپنی بہن کے گھر رہ رہے تھے۔

[۲] سراج الحق صاحب ایم ایم عالم کے دوست تھے۔ ایئر فورس میں فائٹر پائلٹ تھے۔ ان کے بقول ان کا اور ان کے ساتھیوں کا کورٹ مارشل کر کے انہیں نکالا گیا۔ ایم ایم عالم چونکہ قومی ہیرو تھے اس لیے قادیانی سربراہ ان کا کورٹ مارشل تو نہ کر سکا البتہ انہیں ریٹائر کر دیا گیا۔ ایم ایم عالم صاحب اس پر تلخ جذبات رکھتے تھے۔ وہ مشرقی پاکستان سے تھے اور بنگلہ دیش بننے کے بعد حالات اتنے خراب تھے کہ انہوں نے اسے ایشو بنانا مناسب نہیں سمجھا۔

[۳] مَیں ۱۹۸۶ء میں تعلیم کی تکمیل کے بعد لاہور واپس آیا تو ان دنوں افغان جہاد آخری دموں پر تھا۔ جہاد کے ایک حمایتی گروپ سے میرا رابطہ تھا۔ ہم نے باغ جناح میں روسیوں سے چھینے اسلحے کی تین روزہ نمائش رکھی اور آخری دن جناح ہال میں جلسہ کیا جس میں ایم ایم عالم (مرحوم) مہمان خصوصی تھے۔ اسی سلسلے میں ہم ان سے ملنے گئے تھے۔ وہ ہماری دعوت پر لاہور آئے اور جلسے سے خطاب کیا (اس کی تفصیل پھر کبھی)۔

کہا: ’’اِدھر یا اُدھر، ففٹی ففٹی چانسز ہیں جو اللہ کو منظور‘‘۔ مَیں نے آنکھیں بند کیں، موت کا تصور کیا اور اسے خود پر طاری کر لیا تو اس کی خوشبو سونگھ لی۔ تب سے میرا صبح اٹھنے کا مسئلہ حل ہو گیا اور اللہ نے زندگی بھی دے دی۔

مجھے وہ حدیث یاد آ گئی جس میں دنیا کے سب سے ’سچے شخص‘ نے کہا تھا ’کفی بالموت واعظا‘[1] یعنی وعظ و نصیحت اور دل کو نرم کرنے کے لیے موت (کا تصور) کافی ہے۔

مَیں یہ لکھ رہا ہوں تو موت کو یاد رکھنے اور نہ رکھنے کے اثرات کے دو تازہ واقعات یاد آ گئے ہیں۔

* مَیں اور میرے ساتھی پچھلے تین سال سے سکولوں کے مسلمان بچوں کو قرآن سے جوڑنے اور اس کا ترجمہ سکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڑے پیمانے پر یہ کام کرنے کے لیے مادی وسائل درکار تھے جو ہمارے پاس نہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک بندہ ہمارے پاس بھیج دیا۔ اس نے کہا: قرآن کی خدمت کرو، اخراجات جتنے بھی ہوں میرے ذمے۔ مَیں نے پچھلے ہفتے انہیں ۳۰ ہزار پارے دو کلر میں چھپوانے کے لیے کہا۔ حسنِ اتفاق سے چند دن بعد ایک بڑی سکول چین (Chain) اس کام پر آمادہ ہو گئی۔ مَیں ڈونر کے پاس گیا اور جھجکتے ہوئے کہا کہ مزید تیس ہزار پارے چھپوانے ہیں۔ وہ صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے، میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا: ڈاکٹر صاحب! جتنی جلدی ہو سکے میرے زیادہ سے زیادہ پیسے اس کام میں لگوا لیں، زندگی کا کیا پتا، موت کب آ جائے؟

* اور جب موت یاد نہ ہو اور صرف دنیا اور پیسے ہی مقصدِ زندگی ہوں تو پھر رویہ کیسا ہوتا ہے؟ اسی تدریس القرآن پراجیکٹ کے سلسلے میں ہمارا آدمی ایک اسلامی جماعت کی اسلامی سکول چین کے سربراہ کے پاس گیا اور اسے ترغیب دی کہ اپنے سکولوں میں ترجمۂ قرآن لگوا لیں۔ ہم اساتذہ اور طلبہ کو کتابیں بھی فری دیتے ہیں اور اساتذہ کی ٹریننگ بھی فری کرتے ہیں۔ اس نے کہا سیمپل چھوڑ جایئے اور کل آیئے۔ دوسرے دن ہمارا آدمی گیا تو انہوں نے کہا: معذرت خواہ ہوں۔ دراصل آپ کا طریق کار ہمارے کلچر میں فِٹ نہیں بیٹھتا۔ ہم تو کتابوں کے ساتھ سٹیشنری بھی طلبہ کو خود مہیا کرتے ہیں۔ ورک بک، کلر بک، کاپیاں وغیرہ اور ہر آئٹم پر پرافٹ مارجن ہوتا ہے۔ آپ پارے فری دیتے ہیں اور ان پر آپ نے سرخ رنگ میں ’Not for Sale‘ بھی لکھوا رکھا ہے کہ کوئی انہیں بیچ نہیں سکتا تو بات یہ ہے کہ یہ طریقہ ہمارے کلچر کو خراب کرے گا۔ اس لیے معذرت۔ ہم فری میں بچوں کو قرآن نہیں پڑھا سکتے۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل، رقم الحدیث: ۹۸۴

افغانستان　　　حافظ ابرار حسین

اسلامی افغانستان - زوال پذیر مغربی تہذیب کا مدفن

مغربی تہذیب کے موجودہ مراکز (امریکہ و یورپ) اسلامی افغانستان کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہو چکے۔ اب مسلم ممالک بتدریج مغربی استعمار کے چنگل سے نکلیں گے اور اسلامی افغانستان مسلم نشاۃ ثانیہ کا علمبردار بن کر سامنے آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ

ایک مشترک تصور کائنات کی بنیاد پر انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایسا انضباط جو ایک ملت کی ذہنی اور مادی ضرورتوں اور مفادات کی ایک عرصے تک کفایت کر سکے تہذیب کہلاتا ہے۔ ہر تہذیبی مظہر کچھ محدود اور متعین امکانات کا حامل ہوتا ہے۔ یہ امکانات جب مکمل طور پر بروئے کار آ جاتے ہیں تو تہذیب جن انسانی مفادات کی کفیل ہوتی ہے اب ان سے تصادم کی نسبت پیدا کر لیتی ہے۔ جب کبھی کسی تہذیب میں یہ تصادم واقع ہوتا ہے تو پھر اس کے لیے موت کے انتظار کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں بچتا۔ تہذیب جب انسانی مفادات کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے تو قدرت خود تاریخی عمل میں مداخلت کرتی ہے۔ قدرت کی مداخلت کی کئی صورتیں ہیں جو انسانی تاریخ کے مختلف مرحلوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ماضی میں کبھی کسی تہذیب کو ناگہانی آفات سے تباہ کیا گیا ہے تو کبھی جنگوں کے ذریعے۔

جنگوں کی بے شمار شکلیں تاریخ میں مذکور ہیں۔ بیمار اور بانجھ تہذیبوں کو نیست و نابود کرنے کی خاطر قدرت نے کبھی تو قبائلیوں کو غالب تہذیب پر مسلط کیا ہے اور کبھی اس تہذیب کے مختلف مراکز کو باہمی تصادم میں مبتلا کر کے اسے حرف غلط کی طرح لوحِ جہاں سے مٹا دیا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں قبائل ہمیشہ سے موجود چلے آ رہے ہیں۔ یونان کو رومی قبائل نے اس وقت تباہ کر دیا جب یونانی تہذیب میں مزید نمو کے امکانات کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ یونانی تہذیب کے کاٹھ کباڑ سے سلطنت روما وجود پذیر ہوئی۔ جب رومی تہذیب داخلی تضادات کا شکار ہو کر منتشر ہونے لگی تو قدرت نے ہنز قبائل (Huns Tribes) کے ذریعے اس کا خاتمہ کر دیا۔ مسلم تہذیب کے بعض مظاہر چنگیزیوں کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد ازاں خدائے بزرگ و برتر کی تکوینی حکمت کے تحت یورشِ تاتار نے کعبے کی پاسبانی کی صورت اختیار کر لی۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مسلم تہذیب کی نوعیت اور ترکیب وفعلیت تاریخ انسانی میں ظہور کرنے والی باقی تمام تہذیبوں سے قطعی ممیز وممتاز ہے۔

اسلام آخری دین ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔امت مسلمہ خاتم الامم ہے۔مسلم تہذیب اپنے تمام تر تنوع کے باوجود وحدت کی اساس رہی ہے۔توحید،ختم نبوت اور وحدت انسانی جیسے اعتقادات وتصورات مسلم تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے ممتاز کرتے ہیں۔مسلم تہذیبی مظاہر کے زوال کا مطلب اسلام کی تہذیب ساز قوت کا خاتمہ نہیں ہے۔اسلام ماضی میں اپنے تہذیبی مراکز بدلتا رہا ہے۔ایک مسلم تہذیبی مظہر جب اپنے امکانات پورے کر لیتا ہے تو اس میں انحطاط واقع ہو جاتا ہے اور ایک نیا مظہر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ماضی میں ایسا بار ہا ہو چکا ہے۔

دورِ جدید میں بھی مسلم تہذیب کو مغربی جدیدیت کی طرف سے جن چیلنجز کا سامنا ہے مسلم تہذیب بتدریج ان کے مقابل نیا توازن دریافت کرنے کی طرف بڑھ رہی ہے۔مستقبل میں مسلم تہذیب نئی جہت سے ظہور کرے گی اور نئے مسلم تہذیبی مراکز وجود میں آئیں گے۔میرا خیال ہے کہ اس دفعہ مسلم تہذیب کا یہ ظہور خلافت انسانی اور اسلام کے وصف عالمگیریت کی جہت سے ہوگا۔پچھلی دو تین صدیوں میں جدید مغرب کی تمام تر پیش رفت اسلام کے عالمگیر جوہر کے ظہور میں صَرف ہوگی۔اسلام کو اپنی تاریخ میں یہ موقعہ پہلی دفعہ میسر آئے گا۔اس وقت مسلمانانِ عالم کو حال اور مستقبل کو اِس نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔آمدم برسر مطلب،اسلام حقائق کے جس کلی بیان کا نام ہے اس کے مختلف پہلو انسانی احوال اور تاریخی تغیرات کی مناسبت سے تہذیبی سطح پر ظہور کرتے رہتے ہیں۔مسلم تہذیب کی نوعیت،خاصیت اور فعلیت سے متعلقہ ان تصورات کی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ اسلام اور مسلم تہذیب کی تقدیر دیگر تہذیبوں سے قطعی ممیز وممتاز ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں تک جدید مغربی تہذیب اپنے عروج کو چھونے لگی تھی یعنی جدید تہذیب اپنے امکانات کو بروئے کار لانے کے آخری مراحل تقریباً طے کر چکی تھی۔یہ واقعہ ہے کہ دو عظیم جنگوں کے بعد بیسویں صدی کے نصف ثانی میں جدیدیت کا منصوبہ علمی اور عملی ہر دو اعتبار سے بحران کی زد میں آ چکا تھا۔دوسری جنگ عظیم کے بعد مابعد جدید عہد میں ہونے والی

فکری پیش رفت جدیدیت کی تردید کرتے ہوئے صرف شعور کے انہدام پر ہی اصرار نہیں کرتی بلکہ یہ ارضی تاریخ کے بہاؤ میں نسانی تقدیر سے بھی مکمل مایوسی کا اعلان کرتی ہے۔جدیدیت نے ایک طرف تو مطلق انسانی آزادی کا دعویٰ کیا تھا اور دوسری طرف اس نے عقل کو مستقلاً اقدار کا سرچشمہ قرار دیا تھا۔مابعد جدیدیت نے ان دونوں دعوؤں کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ کسی تہذیب کو جب یہ مرحلہ درپیش ہوتا ہے تو اس کا فنا ہونا یقینی ہوجاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے وابستہ انسانی مقاصد مجروح ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔اس وقت جدید مغربی تہذیب انسان کے نوعی اور اخلاقی مفادات کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اب اس سے انسان کی نوعی بقاء کو ہی خطرات لاحق ہیں۔جس تیزی سے جدید مغرب مشین کلچر کو فروغ دیتا جارہا ہے قریب ہے کہ انسانوں کی اکثریت جبر کے علاوہ مکمل تعطل کا شکار ہوکر رہ جائے۔کائنات کی فطرت کو تو پہلے ہی مسخ کیا جا چکا ہے اب انسانی تخلیق میں مداخلت کی تیاریاں ہورہی ہیں تاکہ مرضی کے انسان پیدا کئے جاسکیں۔اس کا امکان یا عدم امکان اس وقت ہمارے زیر بحث نہیں ہے۔ہماری مراد بس یہ ہے کہ ذہانت کو سرمائے کی مرادات پر ڈھال کے خطرناک حد تک فعال کر دیا گیا ہے۔جدید علمیات اور خصوصاً جدید سائنسی علمیت کسی بھی قسم کی اخلاقی قیود اور ذمہ داری قبول کرنے سے انکاری ہے۔اس مسئلے کی وضاحت ایک مثال سے کی جاسکتی ہے۔مثلاً ایک انسان اگر غیر معمولی جسمانی قوت کا حامل ہو تو کیا اسے اس قوت کے استعمال کرنے کی مطلق آزادی ہونی چاہیے؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔اس پر اخلاقی اور قانونی حدود کا اطلاق کیا جائے گا وگرنہ وہ انسان اپنے لیے اور دوسروں کے حق میں سخت مضر ثابت ہوگا۔یہ طاقت اور اخلاق کے باہمی تعلق کا مسئلہ ہے۔ذہانت کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے۔اگر ذہانت اخلاقی قیود سے بے نیاز ہوکر عمل کرے گی تو کائناتی اور انسانی تباہی کا سبب بنے گی۔جدید مغرب نے انسانی ذہانت کی خودمختاری کا التباس پیدا کر کے اسے سرمائے کی غیر مشروط اطاعت پر مامور کر دیا ہے۔

یاد رہے کہ ہمارے نزدیک عقیدے سے ہٹ کر اخلاق کا سرے سے کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔اخلاق عقیدے سے کٹ جائے تو اضافیت کا شکار ہوکر مفاد پرستی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔یہ عقیدے کے انکار کا منطقی لزوم ہے۔اخلاق اپنی اصل میں جبلت کی عقل کے سامنے

ارادی مغلوبیت ہے۔ مگر کون سی عقل کے سامنے؟ اس عقل کے سامنے جو ایمان بالغیب سے بہرہ مند ہو۔ معلوم ہے کہ عقل کی خاصیت اسے غیر سنجیدگی اور عدم مرکزیت پر اکساتی رہتی ہے۔ عقل کے اس مسئلہ کا کوئی بھی حل عقیدے کے اثبات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ عقیدہ عقل کو مرکزیت تو عطا کرتا ہے مگر اسے جبریت کی وحشت سے بچا لے جاتا ہے۔ مغرب نے ابتداء میں عقیدے کو ترک کر کے اخلاق پرستی کا راگ الاپا، لیکن اب وہ اخلاق کی ردتشکیل کا عمل بھی مکمل کر چکا ہے۔ یہ ہے ادراکِ حقائق اور انسان فہمی کے مسئلے پر جدید مغرب کی معراج!

جدیدیت انسان کی وجودی شناخت کو تاریخیت کی سان پر پرکھنے کا نام ہے۔ انسان تغیر اور دوام کے اقالیم کے درمیان وجود جامع ہے۔ وجود کے مراتب کا استحضار انسان کی اولین ذمہ داری ہے۔ انسان اگر یہ ذمہ داری پوری نہ کر سکے تو اس کا تشخص مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جدیدیت تکبر جبکہ مابعد جدیدیت عقل کی حماقت کی معراج ہے۔ یہ امر کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ انسان کی مطلق آزادی کے اثبات کی خاطر لایعنیت کو وجود و شعور کی اصل ثابت کیا جائے۔ حالانکہ انسان کی حقیقی تکلیف آزادی اور معنویت ہے نہ کہ جبر اور لایعنیت! جدیدیت اور مابعد جدیدیت دونوں کے بنیادی مقدمات غیر سنجیدگی اور ہوس پرستی کی بنیاد پر اٹھائے گئے ہیں۔ مغربیوں نے تاریخ کو سٹیج، کائنات کو تھیٹر اور زندگی کو ڈراما سمجھنے کی سنگین غلطی کی ہے۔ اس تناظر میں ہم کہتے ہیں کہ جدید مغرب جدیدیت کی بنیاد پر وجود پذیر ہونے والی نام نہاد تہذیب کے امکانات پورے کر چکا ہے۔ چنانچہ مغرب کے پاس اس وجودی بحران سے نمٹنے کے لئے اندھی طاقت پرستی کے علاوہ اب اور کوئی راستہ باقی نہیں بچا۔ معلوم ہے کہ طاقت پرستی کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

بیسویں صدی میں دو عظیم جنگوں نے یورپ کی سامراجی سلطنتوں کا خاتمہ کر کے جدید تہذیب کے قافلہ آوارگان کی قیادت امریکہ اور روس کے سپرد کر دی تھی۔ ملحوظ خاطر رہے کہ تہذیبوں کے عروج و زوال میں جنگوں نے ہمیشہ فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ یورپی سامراجی سلطنتوں کا خاتمہ بھی ان کی باہمی جنگوں کے نتیجے میں ہوا۔ جدید تہذیب جس درندگی پر بِنا کی گئی تھی وہ بالآخر اپنے ہی بچوں کو ہڑپ کر گئی۔ حالانکہ یورپ ورائے انسانی اعتماد سے بیسویں صدی میں داخل ہوا تھا اور عظیم جنگوں سے پہلے کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ۸۰ فیصد سے زائد زمین پر تسلط

قائم کر لینے والی یورپی سامراجیت داخلی تضادات اور نتیجتاً باہمی جنگوں کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اترے گی لیکن تاریخ ایسی ہی انہونیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ تقدیر کا بھنور ہے جو تدبیر کے حصار کو نگل جاتا ہے۔

جب تقدیر حرکت میں آتی ہے تو تاریخی قوتیں تقدیر کی موافقت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسے میں انسانی تدابیر، توقعات اور ارادے بھی مکمل طور پر تقدیری نتائج کے عملِ ظہور کے تابع ہوجاتے ہیں۔ یہاں اس وہم میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ تقدیر سے اخلاقی جبر لازم آتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تاریخ کے جبر میں تقدیر انسانی آزادی اور معنویت کی واحد ضمانت ہے۔ ہماری رائے میں تقدیر انسان کی بھلائی کے ضمن میں الوہی معاونت ہے۔ تقدیر نہ ہو تو انسان کے تاریخی وجودی احوال جبر قرار پائیں گے۔

یہ تقدیر ہے جو انسان کو جبر سے محفوظ رکھتی ہے اور اس کے وجودی تجربات کو لایعنیت میں نہیں ڈھلنے دیتی۔ جدید مغرب کا بہت سنگین مسئلہ یہ بھی ہے کہ یہ تاریخ کے ہر تجزیے کو محض انسانی سطح پر گھسیٹ لاتا ہے۔ زمان کیا ہے؟ زمان کو کائناتی سکیل پر دیکھا جائے یا انسانی جہت سے، یہ تقدیر کے امکانات کے ظہور کا آلہ ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ تاریخی تغیرات انسانی اور کائناتی امکانات کے ظہور کی ضمانت ہیں اور تقدیر سے ہمارے جوہر انسانیت کو بقا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ دو عظیم جنگوں کے بعد بیسویں صدی کے نصف ثانی میں جدیدیت کا منصوبہ علمی اور عملی ہر دو اعتبار سے بحران کی زد میں آ چکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مابعد جدید عہد میں ہونے والی فکری پیشرفت جدیدیت کی تردید کرتے ہوئے صرف شعور کے انہدام پر ہی اصرار نہیں کرتی بلکہ یہ ارضی تاریخ کے بہاؤ میں انسانی تقدیر سے بھی مکمل مایوسی کا اعلان کرتی ہے۔ جدیدیت نے ایک طرف تو مطلق انسانی آزادی کا دعویٰ کیا تھا اور دوسری طرف اس نے عقل کو مستقلاً معانی اور اقدار کا سرچشمہ قرار دیا تھا۔ مابعد جدیدیت نے جدیدیت کے ان دونوں دعووں کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مابعد جدید فلسفی جدیدیت کی تحلیل و تردید کرتے کرتے سوفسطائیت کے چشمۂ زہر آب میں غرقاب ہو گئے ہیں۔ ایسے میں جدید تہذیب کے تمام تصورات و اقدار اپنی ثقاہت کھو چکے ہیں۔ مابعد جدید عہد میں مغرب تہذیب کی بجائے

لایعنیت کی دلدل میں اٹھنے والے بھونچال سے زیادہ کچھ بھی نہیں رہ گیا۔

گزارش ہے کہ جدید تہذیب کی قیادت ایسے وقت میں امریکہ اور روس کے سپرد ہوئی جب عظیم جنگوں کے نتیجے میں جدیدیت کے منصوبہ کو پہلے ہی شدید بحران کا سامنا تھا۔ امریکہ اور روس بظاہر مختلف بلکہ متضاد سیاسی اور معاشی ایجنڈے کے ساتھ بین الاقوامی منظرنامے پر ابھرے۔ تاہم سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور اس سکے کا نام ہے مادیت پرستی۔ انفرادیت پرستی اور جماعیت پرستی مادہ پرستی ہی کے دو ظہور ہیں۔ حقیقت میں امریکہ اور روس اپنے اپنے انداز سے جدید مغربی تہذیب ہی کی توسیع تھے۔ تقدیر نے انہیں بھی باہمی تصادم کی حالت میں لا کھڑا کیا۔ علاوہ ازیں، ماضی بعید میں قبائل خود غالب تہذیب کے مراکز کی طرف پیش رفت کرتے تھے مگر دورِ جدید میں اس اصول کی تقلیب ہوگئی۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں۔ سب سے بڑی وجہ طاقت کا عدم توازن ہے۔ دورِ جدید میں غالب تہذیب نے خدائے قہار کی تکوینی حکمت کے تحت خود اپنی تباہی کے اسباب فراہم کئے ہیں۔ یعنی یہ خود چل کر قبائل کے چنگل میں پھنسی ہے۔ جدید مغربی تہذیب کے لیے قدرت نے افغانیوں کو قہر بنا دیا ہے۔ سابقہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ جب غالب تہذیب مفاداتِ انسانی کے لیے ضرر رساں ہو جاتی ہے تو قدرت تاریخی عمل میں مداخلت کر کے اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ انسانی تاریخ میں قدرت کی مداخلت کی کئی صورتیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ قدرت قبائل کو غالب تہذیب پر مسلط کر دیتی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ قبائل قدرت کے ہاتھ میں تازیانے کی مثل ہیں۔

افغانستان کے خطے کو قدرت نے جدید تہذیب کے زوال کے آلۂ کار کے طور پر منتخب کیا ہے۔ افغانستان جدید تاریخ میں قہرِ خداوندی کا مظہر بن کر سامنے آیا ہے۔ یہ خطہ زمین طرزِ بود و باش کے اعتبار سے قبائلی اور جدید تمدن سے کوسوں دور ہے۔ چنانچہ اس خطے میں بسنے والوں کا شعور اپنی فطری سادگی پر قائم ہے اور ان کا ارادہ اور قوتِ عمل حقیقی انسانی مفادات کی محافظ ہے۔ افغانستان کی تزویراتی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کر لیجئے کہ اسے Heartland کا اہم ترین حصہ کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دورِ جدید میں افغانستان پر تسلط قائم کرنا دنیا پر غلبہ پانے کی ضمانت ہے۔ بالخصوص ایشیا کے لیے اس کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ بقول علامہ محمد اقبالؒ ایشیا جسدِ واحد کی طرح ہے اور اس کے لیے افغانستان کی اہمیت ایسی ہی ہے جیسی

دل کی انسانی جسم کے لیے۔ایشیا کے فساد وکشاد کا انحصار افغانستان کی اندرونی صورتحال پر ہے۔

ماضی میں بھی خطۂ افغانستان کو اہمیت حاصل تھی لیکن اس کا تناظر مختلف تھا۔تب اس خطے کو صرف ہندوستان میں مستحکم اقتدار کی کنجی سمجھا جاتا تھا۔تاہم بیسویں صدی میں بین الاقوامی سیاست ومعیشت میں درآنے والی تاریخی تبدیلیوں نے افغانستان کی اہمیت میں اضافہ کردیا ہے۔بین الاقوامی سیاست ومعیشت کے مراکز بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائیوں میں مغرب سے مشرق کی طرف منتقل ہونا شروع ہوئے جس کے اسباب معروف ہیں۔مراکز کی اس تبدیلی نے بحیرۂ روم کی بجائے بحر ہند اور اس سے ملحقہ علاقے کی حیثیت مکمل طور پر بدل ڈالی ہے۔افغانستان وسط ایشیا، یورپ، جنوبی ایشیا اور مشرق وسطی کے سنگھم پر واقع ہے۔افغانستان کی اس اہمیت کے پیش نظر عالمی طاقتیں خطرات کے باوجود افغانستان میں تسلط قائم کرنا ضروری سمجھتی رہی ہیں۔چنانچہ روس نے سرد جنگ کے زمانے میں افغانستان کی طرف پیشقدمی کرکے اس پر تسلط قائم کرنے کی کوشش کی تو افغانیوں کے ہاتھوں اس کا زوال ہوگیا۔USSR کے زوال کے بعد ایک طرف تو روس کو اپنے مقبوضہ جات سے ہتھ دھونے پڑے اور دوسری طرف کمیونزم کا پھیلاؤ اپنی خالص شکل میں مستقلا رک گیا۔روس کے زوال کے بعد جدید تہذیب کی دستارِ فضلیت کا سزاوار ایک اکیلا امریکہ قرار پایا۔

امریکہ نے ۱۹۹۱ء کے بعد نیا ورلڈ آرڈر جاری کیا۔یہ ایک طرف سے امریکہ کی عالمی حکومت کے قیام کا اعلان تھا۔فوکو یاما وغیرہ نے روس کے زوال سے یہ فال نکالی کہ تاریخ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔کیونکہ جدید مغربی تہذیب کی لبرل اقدار کے مدمقابل کوئی نظامِ اقدار باقی نہیں رہا۔تاریخ چونکہ جدلیاتی انداز سے سفر کرتی ہے اور امریکہ کے مقابل تمام تہذیبیں سرنگوں ہیں لہٰذا اب تاریخ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔امریکہ رعونت میں مبتلا ہوکر جدید تہذیب کے بحران زدہ منصوبے کو عالمگیر سطح پر فروغ دینے کی مہم پر کمربستہ ہوگیا لیکن تقدیر کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔صرف ایک عشرے کے اندر امریکہ نے نام نہاد مہذب دنیا کی تمام تر جنگی قوت سے افغانستان پر حملہ کرنے کی غلطی کردی۔امریکہ کے گھمنڈ کا عالم یہ تھا کہ اسے لگا وہ تھوڑے ہی عرصے میں افغانستان کو نمونۂ عبرت بنادے گا۔تاہم ۲۰۰۱ء کے بعد جو کچھ ہوا وہ سامنے ہے۔انسانی تاریخ میں یہ واقعہ شائد پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ ایک بے مثل، منظم ترین اور طاقتور ترین جدید جنگی مشینری بھی

استعمار کو فتح نہیں دلوا سکی بلکہ اس جنگ کے نتیجے میں امریکی استعمار کے مفادات پہلے کی نسبت زیادہ خطرات کا شکار ہوئے ہیں۔ افغانی طالبان نے نیٹو اور امریکہ کو اس کے اتحادیوں سمیت شکست، ذلت اور جگ ہنسائی کی عبرتناک مثال بنا دیا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ اکیسویں صدی کے تیسرے عشرے کا آغاز افغانستان میں ایک تاریخ ساز پیشرفت کے ساتھ ہوا ہے۔ امریکہ بالآخر جنگ کی بساط کو لپیٹنے پر مجبور ہو کر افغانستان کو اس نامراد، گھٹیا اور ندیدے عاشق کی طرح خیر باد کہہ چکا ہے جو ہوس کی خاک چھانتے چھانتے مایوسی کی صلیب پر لٹکنے ہمیشہ کے لیے کوئے یار سے بے دخل ہونے کو ہی غنیمت سمجھتا ہے۔ اس صدی کے پچھلے دو عشروں کے دوران افغانستان میں انسانی تاریخ کی بہت بڑی جنگوں میں سے ایک جنگ لڑی گئی جس نے بالعموم بین الاقوامی سیاست و معیشت اور بالخصوص پاکستان اور ایشیائی خطے کو ہمہ جہت طور پر شدید متاثر کیا ہے۔

اس طویل جنگ میں امریکی شکست کے نتائج بہت دوررس ہوں گے جن کا درست اندازہ لگانے میں ابھی وقت لگے گا۔ تاہم چند باتیں تو بالکل واضح ہیں۔ جدید مغرب کی جنگی مشینری بری طرح سے ناکام ہوئی ہے۔ جدید جنگی ٹیکنالوجی کو خدا سمجھنے والوں کے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے جس سے مثلاً امریکہ کا چین وغیرہ کے ساتھ تجارتی توازن بگڑ گیا ہے۔ مزید یہ کہ امریکہ بین الاقوامی commitments سے دستبردار ہوا ہے۔ بین الاقوامی معاہدات پر عمل درآمد کروانے کی امریکی صلاحیت کمزور ہوئی ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں بحران کے آثار ظاہر ہوئے ہیں۔ امریکہ کی انصاف پرستی اور انسانی حقوق کی علمبرداری کی قلعی کھل گئی ہے۔ امریکہ کے عالمی قد کاٹھ میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی ہے۔ جنگ کے دوران چین وغیرہ کو معاشی اور فوجی اعتبارات سے پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے۔ یہ طرفہ تماشا دیکھئے کہ امریکہ نے اپنے تئیں چین کو Contain کرنے کے لیے ہی افغانستان پر حملہ کیا تھا لیکن نتائج امریکہ کے عزائم کے بالکل برعکس نکلے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست Unipolar سے Multipolar ماڈل کی طرف گئی ہے یعنی طاقت اور سرمائے کے نئے مراکز وجود میں آگئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کی افغانستان میں شکست کی بازگشت کئی نسلوں تک سنائی دیتی رہے گی۔

شکست کے بعد اگرچہ امریکی اور نیٹو افواج کے انخلاء کا عمل مکمل ہو چکا ہے لیکن فورسز کے انخلاء کے باوجود امریکہ اس خطے سے لاتعلق نہیں رہے گا۔امریکہ اس خطے میں اپنے مزعومہ مفادات کے تحفظ اور روس، چین، پاکستان اور دیگر علاقائی طاقتوں کا راستہ روکنے کے لیے افغانستان میں مداخلت جاری رکھے گا۔معلوم ہے کہ امریکہ نے افغان حکومت کے ساتھ طویل المدتی سٹرٹیجک پارٹنر شپ کا معاہدہ کر رکھا تھا۔اس کا مطلب یہی تھا کہ امریکہ کو افغانستان میں لمبے عرصے تک مصروف عمل رہنا تھا۔اب کابل رجیم کے خاتمے کے بعد افغانستان کی حکومت طالبان کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے،لیکن امکان پھر بھی یہی ہے کہ امریکہ افغانستان میں کسی نہ کسی طرح اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھنے کی کوشش کرے گا۔

یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ امریکہ ہو یا امریکہ کے مقابل ممالک ہوں سب کے لیے افغانستان زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔سب کو صورتحال کے جبر کے تحت افغانستان میں اپنا اثر ورسوخ یقینی بنانا ہے۔گویا افغانستان عالمی اور خطے کی طاقتوں کے لیے تقدیر کا بچھایا ہوا جال ہے اور سب کا اس جال میں کسی نہ کسی انداز سے trape ہونا مقدر ہے۔اس تناظر میں دیکھا جائے تو واضح معلوم ہوجاتا ہے کہ جدید تہذیب اور اس خطے کے مستقبل کا فیصلہ افغانستان کی سرزمین پر ہوگا۔میری رائے میں اس کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔پہلے مرحلے کا حاصل یہ ہے کہ سرد جنگ کے زمانے میں USSR کا خاتمہ افغانستان کی وجہ سے ہوا اور اب امریکہ کے سپر پاور کے منصب کے انجام کا سبب بھی افغانستان ہی بنا ہے۔

اس عرصے میں جدید تہذیب کی معاشی اور سیاسی قوت منتشر ہوئی ہے۔دوسرے مرحلے میں یہ منتشر قوت بتدریج کمزور ہو کر فنا کے گھاٹ اترے گی۔امریکہ بین الاقوامی چودھراہٹ کے منصب سے معزولی کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ اندرونی تضادات کا شکار ہوگا۔اس کے ساتھ سینٹرل ایشیا میں تسلط کا امریکی خواب بکھرے گا۔یورپ میں امریکہ کے حوالے سے مایوسی بڑھے گی۔اس کے ابتدائی آثار ٹرمپ حکومت کے دوران ظاہر ہو چکے ہیں۔

جہاں تک چین کا تعلق ہے تو اس کے متعلق یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس وقت اس خطے میں چین کے مفادات سی پیک کی بدولت سب سے زیادہ ہیں۔چین اور افغانستان کا ۹۱ کلو میٹر مشترک بارڈر ہے۔چین کے لیے افغانستان کی اہمیت اس کی تزدیراتی حیثیت کی بدولت

غیر معمولی ہے۔ چین کسی صورت میں بھی افغانستان سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ چین کی طرف سے اگر افغانستان میں استعماری مداخلت ہوتی ہے تو آئندہ ایک عشرے کے اندر افغان طالبان اور چین شاید حالتِ جنگ میں ہوں گے۔ اگرچہ اس کا انحصار ایک طرف تو اس بات پر ہے کہ طالبان افغانستان میں دوبارہ اقتدار میں آجانے کے بعد کیا پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ چین کے صوبے سنکیانگ میں بسنے والے ایغور مسلمانوں کا مسئلہ طالبان کی نظر میں ہے۔ دوسری طرف چین کی پالیسی اب تک عدم مداخلت کی رہی ہے لیکن خطے کی بدلی ہوئی صورتحال کے پیش نظر چین شاید مداخلت کا فیصلہ کرے گا۔ اگر ایسا ہوا تو چائنہ کے لیے نہ صرف یہ کہ افغانستان کی طرف سے ترقیاتی منصوبوں میں مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہوجائے گا بلکہ طالبان اور چین میں تصادم بھی ہوسکتا ہے۔

چین اگلے پندرہ بیس سالوں میں عالمی سطح پر امریکہ کی جگہ لینے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ طالبان کے ساتھ تصادم کی غلطی کی صورت میں چین کی استعماری عمر امریکہ سے بھی کم ہوگی جس طرح کہ امریکہ کی استعماری عمر یورپ سے کم تھی۔ جب امریکہ جدید تہذیب کا وارث بنا تھا تو تب جدیدیت بحران کا شکار ہوچکی تھی۔ چین کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ ایسے وقت جدید مغربی تہذیب کا قائد بننے جارہا ہے جب کہ پہلے ہی یہ تہذیب زوال کی حدوں کو چھو رہی ہے۔ چین ظاہری فرق کے باوجود جدید مغربی تہذیب کی ہی توسیع ہے اس کے اصول وفروغ بھی جدید مادیت پرستی سے ماخوذ ہیں۔ چین نے سرمایہ داری اور کمیونزم میں جو بے اصول امتزاج پیدا کیا ہے اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ چین جس تناسب سے سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط ہوگا اسی حساب سے انسانی مفادات کے لیے اس کا ضرر بڑھتا جائے گا اور اس کا انجام بھی بالآخر لاینحل قسم کے داخلی تضادات اور نامختتم بیرونی تصادم کی شکل میں ہوگا۔ پھر یہ کہ چین کی مادی ترقی بھی اپنی انتہا کو پہنچ کر شدید انسانی بحران کی صورت اختیار کرجائے گی۔

افغانستان کا کردار اس تمام منظرنامے میں یہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے مابعد امریکہ چین کی مرکزی صورت حال زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہ پائے گی۔ صورتحال میں اس طرح کی ممکنہ تبدیلی کا مرحلہ شاید طویل پکڑ جائے لیکن ایک بات یقینی ہے کہ آنے والی دو تین دہائیوں میں جدید مغربی تہذیب کا آخری بڑا حصار یعنی چین بری طرح شکست و ریخت کا شکار ہوجائے گا۔ ہماری اس

بات کو تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے نہ کہ محض جذباتی انداز سے۔ ۱۹۱۴ سے ۱۹۴۵ء تک یعنی محض تیس اکیتس سالوں میں یورپ کی سامراجی سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ ۱۹۷۹ سے ۲۰۲۱ء تک صرف ۴۲ سالوں میں دو سپر پاورز نے افغانستان میں دھول چاٹی ہے۔ چین زوال آمادہ جدید تہذیب کی قیادت کے غم میں مبتلا 'مردِ بیمار' ہے جس کی طبعی عمر تاریخ وتہذیب کے اصولوں کی رو سے زیادہ طویل نہیں ہے۔ چین کی شکست وریخت کے موقع پر جدیدیت اور سرمایہ داری کی بنیاد پر قائم جدید تہذیب کا محافظ عالمی نظام بھی برقرار نہیں رہ پائے گا۔ یہ وہ وقت ہوگا جب دنیا تہذیبی اعتبار سے ایک نئے یعنی مابعد مغرب دور میں داخل ہوگی۔ نیا عالمی نظام تشکیل پائے گا۔ نئے بین الاقوامی قوانین مرتب ہوں گے۔ جدید تہذیب کے تسلط کا خاتمہ ہوجائے گا۔ انسانیت کو مغربی استعمار اور اس کے ایشیائی گماشتوں سے نجات ملے گی۔ یاد رہے کہ اس سارے عمل میں افغانستان کا کردار مرکزی اور فیصلہ کن ہوگا۔ اس طرح افغانستان کے بین الاقوامی کردار کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوگا۔

افغانستان استعمار کے مقابل جس عزیمت سے لڑا ہے وہ صرف ملت اسلامیہ ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی طرف سے فرض کفایہ کی ادائیگی کا عمل بن گیا ہے۔ افغانیوں نے مزاحمت کا راستہ اختیار کر کے اپنی انسانیت سے دستبردار ہونے سے انکار کیا ہے۔ استعمار مخالف اس حالیہ طویل جنگ میں طالبان نے اگرچہ ہراول دستے کا کام کیا ہے لیکن افغانستان کا اجتماعی شعور اگر ان کا موید نہ ہوتا تو وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ دور جدید میں افغانستان کی طرف سے استعمار مخالف جدوجہد کا آغاز طالبان نے نہیں کیا۔ معلوم ہے کہ طالبان سوویت روس کے زوال کے بعد منظر پر آئے ہیں۔ استعماری تہذیب کو سرنگوں کرنے کا مرحلہ وار کارنامہ سرانجام دینے کا اعزاز مجموعی طور پر تمام افغانستان کو حاصل ہوا ہے۔ اگر ایک قلیل تعداد میں استعمار کی حمایت کرنے والے عناصر افغانستان میں موجود رہے ہیں تو عرض ہے کہ کمزور بچے کس گھر میں نہیں ہوتے۔ افغانستان کے مسئلے کو درست سیاق وسباق میں سمجھنا خاصا مشکل اس لیے ہے کہ استعمار نے میڈیا کے ذریعے غیر معمولی انداز سے اس کی انجینئرنگ کی ہے۔ لوگ عام طور پر جزئیات میں الجھ گئے ہیں۔ مسلم شعور استعمار کے غلبے کو اس قدر جذب کر چکا ہے کہ اسے اب اپنی فتوحات پر یقین ہی نہیں آتا۔ افغانیوں نے ثابت کر دیا ہے کہ استعمار کے خلاف مزاحمت

ہی وہ واحد راستہ ہے جو شعور کو اس کے عصری حوالوں کا تابع مہمل بننے سے بچا سکتا ہے۔

یہ کہنا بجا ہے کہ ابھی افغانستان کا استعمار مخالف کردار ختم نہیں ہوا۔ افغانستان کا یہ کردار دوسرے مرحلے کی تکمیل کے ساتھ اپنی انتہاء کو پہنچ جائے گا۔ تیسرے مرحلے میں افغانستان کا کردار سلبی سے زیادہ ایجابی ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ افغانستان دور جدید میں مسلم تہذیب کو مطلوب توازن حاصل کر لے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افغانیوں کی نفسیات میں مرعوبیت نہیں ہے۔ جدید تہذیبی اوضاع کے حوالے سے ان کا ترک واختیار ارادی ہوگا۔ میرا احساس ہے کہ اسلام کا جدید تہذیبی ظہور افغانستان کی سرزمین پر ہوگا جو کہ بہت متوازن اور توانا ہوگا۔ اصول یہ ہے کہ غالب تہذیب کے وسط میں یا اس کی سرحدوں پر قدرت نئے امکانات کی پرورش کرتی ہے۔ افغانستان کا خطہ اسی حیثیت کا حامل ہے۔ مسلم تہذیب کو جو اقداری توازن یہاں پر حاصل ہوگا وہ دیگر مسلم ممالک کے لیے نمونے کا کام کرے گا۔ مسلم ممالک کو چاہیے کہ وہ ابھی سے مستقبل کے ان امکانات کو نظر میں رکھ کر اپنے سیاسی اور تہذیبی سفر کی سمت کا تعین کریں۔

بقیہ: پاکستان کی معاشی تباہی-حل موجود ہے

ہم پیداواری شعبوں میں سرکاری سرمایہ کاری اس سطح پر لے جاتے جو وہ 1980-1975ء کے دوران تھی۔ 19-2018ء میں سرمایہ کاری قومی مجموعی سرمایہ کاری کا 6 فی صد تھی اور صنعتی اور زرعی شعبہ میں سرکاری سرمایہ کاری کو کوئی وجود نہیں تھا۔ سرکاری سرمایہ کاری کے عدم وجود کے نتیجہ میں پاکستان کی بھاری صنعتیں روبہ زوال ہیں اور ہم ٹیکنولوجیکل ایجادات سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ پاکستانی معیشت کی اصل کمزوری حکومتی خسارہ (Public Deficit) میں اضافہ نہیں بلکہ وہ ساختی انجماد (Structural state) ہے جس کی وجہ سے پاکستانی محنت کشوں کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ نہیں ہوسکتا ہے۔ پیداواری سکت میں اضافہ کے لئے بھاری صنعتوں اور Technology Initiatives کا بڑھانا ضروری ہے اور یہ صرف سرکاری سرمایہ کاری کے ذریعہ ہی ممکن ہوتا ہے۔ بھاری صنعتوں (مشینری، الیکٹرانکس، ہارڈ ویئر، کیمیکل اور پیٹرولیم وغیرہ) میں فروغ کے ذریعہ محنت کشوں کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ خود دار قومی اسلامی حکومت کے معاشی ایجنڈا کا اہم جزو ہوگا۔

مطالعۂ کتاب امین اشعر

'دروسِ سرمایہ داری'
از ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

کتاب 'دروسِ سرمایہ داری' حال ہی میں شائع ہونے والی ایک معرکتہ الآراء کتاب ہے جسے جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کے شاگردوں نے مرتب کیا ہے۔ یہ بنیادی طور پر دینی مدارس اور دینی جماعتوں کے کارکنان، علماء وطلبہ، خصوصاً تخصصات کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں تحفظ وغلبۂ دین کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں جب سرمایہ دارانہ نظام کو ہمہ گیر عالمی غلبہ حاصل ہے۔ جاہلی عقلیت کا سرمایہ دارانہ مظہر (rationality) انسان کو ہیومن بی انگ گردانتا ہے یعنی خودمختار اور قائم بالذات فرد، ایسا فرد جو کسی ہستی کو جواب دہ نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ انسان ہیومن بی انگ نہیں۔ ہیومن بی انگ تو شیطان ہے کیونکہ خودمختاری کا دعویٰ سب سے پہلے ابلیس نے کیا تھا۔

لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام کی پوری عمارت ایک نامعقول، باطل اور جاہلی تصورِ انسان پر استوار کی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں جس معاشرت، معیشت اور اخلاقیات کی صورت گری ہوئی ہے؛ اس نے آج بنی نوع انسان کو تباہی وبربادی کے گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ پاکستان اس وقت سرمایہ دارانہ تحکم اور تغلب کی بدترین مثال ہے۔

بحیثیت مسلمان ہم اس کے مکلف ہیں کہ اس جاہلی نظام کا مقابلہ کریں اور اسے پسپائی پر مجبور کر دیں۔ لیکن یہ کام اسی وقت ممکن ہے جب ہم اس نظام کی بنیادوں سے کماحقہ واقف ہوں۔

چوں کہ ہمارے ہاں ابھی تک مغربی فلسفہ وتہذیب کے عمومی مظاہر ہی زیر بحث آتے ہیں، اس کے پس منظر میں کارفرما افکار ونظریات کے مطالعہ ونقد کی روایت نہایت کمزور ہے، اس لیے سرمایہ دارانہ نظام کی کماحقہ تفہیم نہیں ہے۔ خصوصاً ہماری اسلامی جماعتوں اور دینی تعلیم گاہوں میں ابھی تک یہ مباحث بالکل اجنبی ہیں۔ روایتی دینی حلقے، مذہبی جماعتوں کی قیادتیں اور ان کے کارکنان سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت وماہیت؛ اور اس کے ہمہ گیر ابلیسانہ تسلط سے واقف نہیں۔ ہمارے مذہبی حلقے سرمایہ داری کی درست تفہیم نہ ہونے کی وجہ سے اسے چیلنج نہیں کر پا رہے۔

انہیں اس بات کا ادراک نہیں کہ یہ سرمایہ داری کا غلبہ ہی ہے جس نے دینی جماعتوں اور غلبہَ دین کی تحریکوں کے کردار کو محدود وغیر مؤثر کر دیا ہے۔ اس لاعلمی کی بنا پر تحفظ وغلبہ دین کی تحریکیں اپنی تمام تر مخلصانہ جدوجہد کے باوجود اپنے اہداف تک پہنچنے میں ناکام ہیں۔

دینی جماعتوں میں یہ احساس تو پایا جاتا ہے کہ اسلام ایک مکمل دین اور نظام حیات ہے مگر ہمارے ہاں ایسے افراد اور گروہ بھی پائے جاتے ہیں جو دانستہ و نادانستہ طور پر اسلام میں سرمایہ دارانہ نظام کی پیوندکاری کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی تناظر میں افغانستان کے معاملے کو دیکھا جا سکتا ہے کہ طویل جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کے بعد آزادی حاصل کرنے والا ملک آج ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے کہ وہ کسی وقت بھی عالمی سامراجی سرمایہ دارنہ نظام کا حصہ بن سکتا ہے، اس لیے کہ وہاں سامراج کو عسکری شکست تو ہوئی ہے مگر نظاماتی شکست نہیں ہوئی۔

چنانچہ ضروری تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے فکری اور فلسفیانہ مباحث، سرمایہ دارانہ اداروں اور سرمایہ دارانہ معیشت کو حتی الامکان آسان، سادہ اور عام فہم اسلوب میں امت کے نوجوانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ 'دروسِ سرمایہ داری' اسی جذبے کے تحت تیار کی گئی ہے۔

کتاب 'دروسِ سرمایہ داری' 23 / ابواب پر مشتمل ہے۔

باب نمبر 1 "سرمایہ داری سے مقابلے کی ضرورت" کے عنوان سے ہے۔

اس باب میں تحفظ دین اور غلبہَ دین کی جدوجہد کی فرضیت سے بحث کی گئی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے غلبے، طرز حیات اور سرمایہ داری سے مقابلے کے خدوخال بھی واضح کیے گئے ہیں۔

باب 2 "سرمایہ داری کی فکری اساس" کے عنوان سے ہے، جس میں یورپی خطوں میں جدید افکار کی پذیرائی، عیسائیت کی بطور مذہب پسپائی، تحریک نشاۃِ ثانیہ، تحریک تنویر اور تحریک رومانویت کے پس منظر کو بیان کیا گیا ہے۔

☆ تیسرا، چوتھا اور پانچواں باب بالترتیب سرمایہ دارانہ عقائد "آزادی، مساوات اور ترقی" سے بحث کرتا ہے۔ چوتھے باب کے ضمن میں اقوام متحد کے چارٹر، ہیومن رائٹس (انسانی حقوق کا چارٹر) کے فلسفہ کا تاریخی پس منظر اور مختصر خلاصہ، انسانی حقوق کے جبری نفاذ کے لیے استعمار کی کارفرمائی کو بیان کیا گیا ہے۔

☆ باب 6 تا 12 سرمایہ دارانہ نظریات یعنی سیکولرازم، لبرل ازم، نیشنل ازم (قوم

پرستی)،سوشلزم،انارکزم،نیولبرل ازم کی تفہیم پر مبنی ہیں۔

باب نمبر 13: پوسٹ ماڈرن ازم کے تنویری افکار کی تنقید پر مشتمل ہے۔

باب نمبر 14: سرمایہ دارانہ علمیت کے عنوان سے ہے۔اس باب میں جدید دہریہ تصورات علم سے بحث کی گئی ہے۔یہ باب سائنسی علم کی نوعیت،سرمایہ دارانہ تصور حقیقت،سرمایہ دارانہ علم کی خصوصیات،سرمایہ دارانہ علم کی تشکیل،سرمایہ دارانہ علم کی منطقی منزل جیسے مباحث پر مبنی ہے۔

باب نمبر 15 :"وحی،سائنس،اور ٹیکنالوجی" کے عنوان سے ہے۔یہ باب عیسائیت اور سائنس،جدید سائنس اور اس کے اغراض ومقاصد،سائنس کا ارتقائی نظریہ سچائی،سائنٹیفک میتھڈ،پس جدیدیت اور سائنس،ٹیکنو سائنس جیسے موضوعات سے بحث کرتا ہے۔

باب نمبر 16:"سرمایہ دارانہ ثقافت اور جمالیات" کے عنوان سے ہے۔اس باب میں سرمایہ دارانہ ثقافت،سرمایہ دارانہ انفرادیت،آرٹ کی کموڈی فیکیشن،گلوبل سٹی کی حقیقت وماہیت بیان کی گئی ہے۔

باب نمبر 17 کا عنوان ہے"لبرل سرمایہ دارانہ ریاست کی حقیقت اور ماہیت"۔اس باب میں بتایا گیا ہے کہ سرمایہ داری اپنے تحکم اور اقتدار کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرتی ہے؟فرماں روائی کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے؟سرمایہ دارانہ نظام کی کارفرمائی کے آلہ کار افراد کون ہوتے ہیں؟سرمایہ دارانہ اقتدار کے حامل اداروں کی ماہیت کیا ہوتی ہے؟نمائندگی کے اداروں کی ہیئت کیسی ہوتی ہے،ان تمام سوالوں کا جواب اس کتاب میں ملتا ہے۔

باب نمبر 18 "پاکستانی ریاست اور لبرل ازم" کے نام سے ہے۔اس باب میں پاکستانی ریاست کی تیزی سے بدلتی ماہیت کو بیان کیا گیا ہے۔

باب نمبر 19 کا عنوان"سرمایہ داری اور جمہوریت ہے"۔اس باب میں سرمایہ دارانہ نظام،طرز حیات اور جمہوریت کی کارفرمائی پر بحث کی گئی ہے۔

باب نمبر 20 :"ہیومن رائٹس اور سامراج" کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ہیومن رائٹس(انسانی حقوق) کے فلسفیانہ پس منظر کو بیان کرنے ساتھ ساتھ ہیومن رائٹس کی سامراجیت پر سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔

☆باب نمبر 21: فلسفۂ یونان کے ابطال اور امام غزالیؒ کے طریق کار پر ہے۔

باب نمبر 22: میں ردِّ فکر یونان میں امام غزالی رحمہ اللہ کا منہج زیر بحث آیا ہے۔

یہ آخری دو باب اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کے یونانی فلسفہ کے تعاقب کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ انہوں نے کس منہج پر یونانی فکر کو شکست دی اور کیونکر آج اسی منہج کو بروئے کار لاتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کو شکست دی جاسکتی ہے۔

☆باب نمبر 23 "سرمایہ داری کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟" کے عنوان سے ہے۔ یہ باب کتاب کا ماحصل ہے۔ سرمایہ دارانہ غلبہ طویل المدت نوعیت کا ہے اور پاکستان جیسے چھوٹے سے ملک میں اس کو چیلنج کرنے کی صلاحیت بھی محدود ہے۔ اس کے باوجود اگر اسلامی انقلابی قوتیں حالات کا صحیح ادراک کرتے ہوئے عوامی مذہبی تحرک، تنظیم اور مخلصین دین کے اقتدار کے قیام کا بیڑہ اٹھالیں تو سرمایہ دارانہ نظاماتی غلبہ کو کسی نہ کسی حد تک چیلنج کیا جاسکتا ہے۔

اس باب میں اُس حکمت عملی کے اشارات مرتب کیے گئے ہیں جنہیں بروئے کار لاتے ہوئے جاہلیت خالصہ نظام سرمایہ داری کو شکست سے دو چار کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے خیال میں جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کے شاگردوں نے آئندہ کئی دہائیوں تک کے لیے ایک ایسی شمع روشن کردی ہے جس سے اسلامی انقلاب کا ہر راہرو روشنی پاتا رہے گا۔ اگر اس کتاب کا کسی مسلکی یا تنظیمی تعصب کے بغیر مطالعہ کیا جائے گا تو ان شاء اللہ ہر دینی کارکن اسے اپنے دل کی آواز پائے گا۔

عہدِ نو برق ہے، آتش زدہ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے

اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
امتِ ختمِ رسلؐ شعلہ بہ پیرہن ہے

آج بھی جو ہو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

کتاب کا انتساب مولانا مفتی محمودؒ، علامہ شاہ احمد نورانیؒ اور قاضی حسین احمدؒ کے نام ہے۔ یہ کتاب جامعہ بنوری ٹاؤن کے مکتبوں سے دستیاب ہے۔ درج ذیل نمبروں پر بھی رابطہ کر کے حاصل کی جاسکتی ہے: 0318-2843334_0333-2122756

اشاریہ البرہان ۲۰۲۱ء

جنوری

مشمولات

○ تعلیم و تربیت
- حکومتی یکساں نصاب۔ تعلیم کے ساتھ بھونڈا مذاق — پروفیسر ملک محمد حسین — ۴
- علم و عمل میں تلازم — ڈاکٹر محمد امین — ۷
- تعلیمی اداروں میں جنسی دہشت گردی — نائب مدیر — ۹
- نفسی قوتوں کا فہم بذریعہ نصابی کتب — حافظ محمد موسیٰ بھٹو — ۱۲
- ماہر تعلیم عزیز احمد مرزا کی یاد میں — نائب مدیر — ۱۵

○ کورونا
- کورونا: مغرب کی صحت پالیسی کا منطقی نتیجہ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۱۹
- کورونا: ابلاغی دہشت گردی — ڈاکٹر شہزاد اقبال شام — ۲۸
- کورونا میں تعلیمی اداروں کی بندش — ادارہ — ۳۰

○ مطالعۂ کتاب
- ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی کتاب کا تجزیاتی مطالعہ — مدیر — ۳۲
- پاکستان میں غلبۂ دین کی حکمت عملی: تبدیلی ناگزیر ہے

○ تفہیم مغرب
- سیکولرزم خلاف عقل و دانش ہے — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ — ۳۶
- مغرب کا جدید مذہب: ’ہیومنزم‘ — ڈاکٹر زاہد صدیق مغل — ۳۷

○ تفہیم دین
- دینی مباحث میں اختلاف، تنقید اور گمراہی — مدیر — ۳۹
- مقاصد بعثت رسول ﷺ — حافظ عاطف وحید — ۴۴
- اصطلاحات کی جنگ — ڈاکٹر طاہر الاسلام — ۴۷

○ اسلام اور پاکستان
- تجاویز برائے تحریک انسداد سود — ڈاکٹر محمد امین — ۵۲
- نوحۂ سقوط ڈھاکہ: ۱۶ دسمبر — احمد فراز — ۵۳

○ استفسارات
تجدد کا شبہ — مدیر — ۵۴

○ ایک لوہار کی
منافقت مردہ باد — عبداللہ میر — ۵۵

○ اشاریہ البرہان ۲۰۲۰ء — ادارہ — ۵۶

فروری

مشمولات

○ فکر و نظر
افکار تازہ — مدیر — ۴

○ تعلیم و تربیت
- نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کا کردار — پروفیسر ملک محمد حسین — ۸
- سائنس کی اسلامائزیشن ممکن نہیں — ڈاکٹر زاہد صدیق مغل — ۱۱
- دینی مدارس کے وفاقوں کے تنظیمی مسائل — عبداللہ میر — ۱۶

○ تفہیم مغرب
کرسپر ٹیکنالوجی — ڈاکٹر محمد رضوان — ۲۳

○ دینی تحریکیں
ایک ہمہ جہت نئی دینی اصلاحی تحریک کی ضرورت — ڈاکٹر محمد امین — ۳۶

○ مطالعۂ کتاب
’پاکستان کی دینی قوتیں غیر موثر اور ناکام کیوں؟‘ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۵۱

○ تبصرۂ کتب
’جماعت اسلامی۔ کل اور آج‘ — مدیر — ۵۸

مارچ

مشمولات

○ فکر و نظر
معیشت۔ ہمارے بزدل حکمران — ۴

○ تعلیم و تربیت
- علم کیا ہے؟ — احمد جاوید — ۵
- پاکستان میں انگریزی کا تسلط محض بے عقلی ہے — ایاز امیر — ۷
- مسالک سے بالاتر اور اصلاح پسند نئے وفاق کی ضرورت — مدیر — ۱۰
- اوقاف آرڈیننس میں تبدیلی — ڈاکٹر راغب حسین نعیمی — ۱۶

○ تزکیۂ نفس
اللہ اپنے بندے کو سزا کیوں دیتا ہے؟ — اشفاق احمد — ۲۲

○ دینی تحریکیں
ایک ہمہ جہت نئی دینی اصلاحی تحریک کی ضرورت (۲) — مدیر — ۲۴

○ تفہیم اسلام
جدید ٹیکنالوجی۔ قرآن کے لیے چیلنج نہیں — ڈاکٹر محمد امین — ۴۱

○ تفہیم مغرب
ٹیکنو سائنس.... ایک تجزیہ — سید ذیشان ارشد — ۴۶

○ مطالعۂ کتاب
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب سے مکالمہ — مدیر — ۵۰
اصلاح اور اقامتِ دین متغایر تصورات نہیں

○ تبصرۂ کتب
’قلم قتلے‘ از ڈاکٹر انوار احمد بگوی — ملک شفقت حیات اعوان — ۵۷

اپریل

مشمولات

○ فکر و نظر
اے غلامو! کیا تم سنتے ہو؟ — مولانا ابوالحسن علی ندویؒ — ۴

○ تعلیم و تربیت
- ماسٹر غلام قادر کیوں واپس آئے؟ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۶
- فضلاء مدارس دینیہ کی خدمت میں چند گزارشات — پروفیسر ڈاکٹر طفیل ہاشمی — ۱۱

○ اسلام اور عالم اسلام
- کیا نظامِ خلافت کی بحالی ممکن ہے؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۱۸
- مسلم معاشروں میں بڑھتا ہوا الحاد — ۲۰
- تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں — ادارہ — ۲۵

○ پاکستانیات
امریکہ میں تبدیلی۔ پاکستان میں تبدیلی — پروفیسر عاصم حفیظ — ۲۷

○ تفہیم مغرب
- سرمایہ داری اور سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے؟ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۳۰
- مغربی استعمار کے جدید استعماری ہتھکنڈے — پروفیسر ملک محمد حسین — ۳۸

○ دینی تحریکیں
ایک ہمہ جہت نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت (آخری قسط) — مدیر — ۴۷

○ ہماری سرگرمیاں
روداد فکری نشست (۱) — ادارہ — ۵۰

○ مطالعۂ کتاب
’متحدہ اسلام کا منشور‘ از راشد شاذ (بھارت) — ڈاکٹر محمد امین — ۵۱
تجدد کا ایک نیا روپ

مئی

مشمولات

○تعلیم وتربیت
– قومی تعلیمی نصاب اور اقلیتوں کے اعتراضات پروفیسر ملک محمد حسین ۴
– تعلیم، سیکولرزم اور اقلیتیں پروفیسر ملک محمد حسین ۷
– سپریم کورٹ میں زیر سماعت کیس بسلسلہ نصاب ودرسی کتب ۱۰
– پاکستان کے مستقبل کے خلاف ایک گھناؤنی سازش ۱۵
– یکساں قومی نصاب تعلیم ڈاکٹر حسین احمد پراچہ ۱۷
– ہر ریاست کا نصابِ تعلیم: ریاست کے نظریہ پر مبنی ہوتا ہے اوریا مقبول جان ۲۰
– اسلامی نصاب کے متعلق تشویش انصار عباسی ۲۳
– نصاب تعلیم ایک بار پھر سازشوں کی زد میں ڈاکٹر سمیرا ملک ۲۵
○اسلام اور پاکستان
– نیا اوقاف ایکٹ۔خلاف شریعت وخلاف آئین ہے مفتی محمد تقی عثمانی ۲۸
– اسٹیبلشمنٹ اور تحریک لبیک ڈاکٹر محمد امین ۳۶
○تفہیم دین
'خاموش انقلاب ناگزیر ہے' مدیر ۴۰
○تزکیۂ نفس
– کیا اوراد و اشغال بدعت اور خلاف شریعت ہیں؟ مولانا محمد منظور نعمانیؒ ۴۶
– رمضان المبارک ہمیں بدلتا کیوں نہیں؟ مدیر ۵۵
○تفہیم مغرب
مغربیات۔حسنِ عقیدت عبداللہ میر ۵۶
○استفسارات
اقامتِ دین کا مفہوم ڈاکٹر محمد امین ۵۷

جون

مشمولات

○بیت المقدس/الظطی
کہاں ہوتم؟ ڈاکٹر سیف اللہ فیضی ۴
○تعلیم وتربیت
– سپریم کورٹ کیس: تعلیم پر اقلیتوں کے اعتراضات کا جائزہ، تجاویز اور سفارشات پروفیسر ملک محمد حسین ۶
– تعلیم میں مسابقت کا شیطانی کھیل سید خالد جامعی ۱۸
○دینی مدارس
– حقیقی تعلیمی مسائل سے حکومت اور علماء کی غفلت ڈاکٹر محمد امین ۲۰
– 'مجمع العلوم الاسلامیہ' کی حمایت کا اعلان ۲۴
○تفہیم اسلام
– اقامت دین اور غلبۂ دین کی بحث مدیر ۳۰
○یادرفتگان
– مولانا وحید الدین خانؒ۔حاصل جدوجہد محمد دین جوہر ۳۳
– مولانا وحید الدین خانؒ پر شاہنواز فاروقی کی ناروا تنقید مدیر ۳۴
○عالم اسلام
سانحہ بیت المقدس اور سیکولر مسلم حکمران اوریا مقبول جان ۳۶
○میں نے زندگی سے کیا سیکھا؟
کرونا کی تکلیف وتجربات مدیر ۳۹
○تفہیم مغرب
مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے افکار وآراء ایک مختصر مگر جامع تجزیہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۴۷

جولائی

مشمولات

○تعلیم وتربیت
– تعلیمی اداروں میں اخلاقی تربیت کا فقدان پروفیسر ملک محمد حسین ۴
– نئی قومی تعلیمیڈ پالیسی۔لبرلزم اور سیکولرزم کے نرغے میں ۶
○دینی مدارس
– فضل وکمال کی ساری جگہیں خالی ہیں ڈاکٹر محمد اکرم ندوی ۱۰
– دینی مدارس اور حکومت کا رویہ ڈاکٹر محمد امین ۱۴
– دینی مدارس کی ڈگریوں کے تسلیم نہ کیے جانے کا مسئلہ ۱۵
○اسلام اور پاکستان
– ایک نئے مشترکہ دینی پلیٹ فارم کی ضرورت ڈاکٹر محمد امین ۱۸
– بیانیے کی قوت اور اس کا فروغ ونفاذ پروفیسر ملک محمد حسین ۲۱
○تزکیۂ نفس
– کیا آپ کا قلب بیمار ہے؟ امام ابن قیم الجوزیہ ۲۸
– ایک تھا لوہار ادارہ ۲۹
○تفہیم مغرب
– مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے افکار وآراء (۲) ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۳۱
– جدیدیت اور روایت۔قدیم بحث، عصری تناظر وحید مراد ۳۹
○مطالعۂ کتاب
– البرہان جون ۲۰۲۱ء پر تبصرہ سید خالد جامعی ۴۸
– 'آدابِ اختلاف اور اتحادِ امت' از ڈاکٹر اختر حسین عزمی ڈاکٹر انوار احمد بگوی ۵۲
○یادرفتگان
راہِ خلد بریں چلے۔علامہ محمد خلیل الرحمن قادریؒ مدیر ۵۵
○استفسارات
مولانا وحید الدین خاں کی فکر مدیر ۵۶
○مطالعۂ کتب
کتاب نما مدیر ۵۷

اگست

مشمولات

○فکرونظر
نادان دوست مدیر ۴
○تعلیم وتربیت
– غیر ملکی پبلشر کی کتاب پر پابندی عامر خاکوانی ۵
– یکساں قومی نصاب اور دینی مدارس کا نظامِ تعلیم ڈاکٹر اکرام الحق ۷
– تعلیم میں بعض علماء کرام کی مغرب سے مرعوبیت مدیر ۱۱
○تزکیۂ نفس
میں اللہ کا شکر کیوں ادا کروں؟ جاوید چوہدری ۱۲
○اسلام اور پاکستان
– گھریلو تشدد بل: ہم غافل لوگ ڈاکٹر محمد امین ۱۶
– گھریلو تشدد بل کی اساس مغرب کی الحادی تہذیب ہے ۱۷
– مغرب پاکستان میں غیر اسلامی قانون سازی کیسے کراتا ہے؟ عاصم حفیظ ۲۱
– اجتماعی قربانی خلاف مقاصد شریعت ہے مولانا احتشام صدیقی ۲۶
○اسلام اور مغرب
– مغربی تہذیب دینِ کفر اور دینِ غیر اللہ ہے مدیر ۲۸
– مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے افکار وآراء (آخری قسط) ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۳۴
○عالم اسلام
عصر حاضر کا مجاہد اعظم ادارہ ۴۲
○استفسارات
جدید اسلامی تحریکیں کیوں کامیاب نہیں ہوسکیں؟ مدیر ۵۸

ستمبر — مشمولات

○ فکرو نظر
اے دانش مغرب — محمود شام — ۴

○ تعلیم و تربیت
-سنگل نیشنل کریکولم: ایک مغالطہ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۵
-ایک مدرسے کا انقلاب — ۱۲
- کتاب مر رہی ہے — عاصم حفیظ — ۱۴
اسے بچانے میں اپنا کردار ادا کیجیے
-یکساں قومی نصاب: پرانا راگ، نیا انداز — ڈاکٹر شوکت علی — ۱۶

○ تزکیۂ نفس
- مرتے ہوئے کلمہ کیوں نصیب نہیں ہوتا؟ — ادارہ — ۲۰
- حجرۂ نبوی: عروج کا سمبل — سید خالد جامعی — ۲۱

○ پاکستانیات
یادگار پاکستان حادثہ- حکومت سارے پہلو سامنے رکھے — مدیر — ۲۲

○ افغانستان
- عصر حاضر کا مجاہد اعظم (آخری قسط) — ادارہ — ۲۳
- ملا عمرؒ کی اسلامی تحریک: ہمارے لیے رول ماڈل — حافظ محمد موسیٰ بھٹو — ۳۸
جدید اسلامی تحریکوں کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے
- طالبان افغانستان کے لیے چیلنج — مدیر — ۴۲
- طالبان کی معاشی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۴۴
-ترقی کا مغربی ماڈل اور طالبان — سید خالد جامعی — ۵۰
-افغان انقلاب: پاکستان پر اثرات — ڈاکٹر محمد امین — ۵۳

○ استفسارات
اسلامی تحریکیں کیوں کامیاب نہیں ہو سکیں؟ — مدیر — ۵۷

نومبر — مشمولات

○ فکرو نظر
ظالمانہ بے حسی — مدیر — ۴

○ تعلیم و تربیت
- عہد نبوی کے اصولِ تعلیم و تربیت — مفتی ڈاکٹر محمد کریم خان — ۶
- اسلامی معاشرے میں جامعات کا کردار — پروفیسر ملک محمد حسین — ۱۱
- جدید اسلامی ریاست میں پرائمری کا نصاب — ڈاکٹر محمد امین — ۲۲

○ تزکیۂ نفس
تاتاریوں میں اشاعت اسلام — مولانا ابوالحسن علی ندویؒ — ۲۴
تزکیہ و تصوف کا کردار

○ افغانستان
- جنگ ابھی جاری ہے — ڈاکٹر محمد امین — ۲۹
- طالبان حکومت سے ناجائز مطالبے — ۳۰
- طالبان کا نظامِ تعلیم کیسا ہونا چاہیے؟ — ۳۲
- اسلامی معاشرے میں خواتین کا کردار — ۳۸
طالبان اور اسلام کا معاشرتی نظام
• طالبان کا معاشی نظام — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
- طالبان حکومت قحط سالی کا مقابلہ کیسے کرے؟ — ۴۴
- نام نہاد 'اسلامی بینکاری' سے طالبان کو شدید خطرہ — ۴۸
- طالبان مغرب کے نظامِ سرمایہ داری سے کیسے بچیں؟ — ۵۲
▪ طالبان کا سیاسی نظام
- طالبان کو جمہوری عمل رد کر دینا چاہیے — ۵۷

○ تفہیم دین
- تلاوتِ دین یا اقامتِ دین؟ — مدیر — ۶۱
- کیا ہم پاکستانی واقعی غریب ہیں؟ — پروفیسر ایم اے رفرف — ۶۷

○ تفہیم مغرب
مغربی تہذیب دینِ کفر اور دینِ غیر اللہ ہے (تیسری قسط) — مدیر — ۶۹
مسلمانوں پر اس کا رد واجب اور اس کی پیروی حرام ہے

اکتوبر — مشمولات

○ فکرو نظر
ڈٹے رہیے — مدیر — ۵

○ اسلام اور پاکستان
- اشاعتِ اسلام جرم ہے؟ — مفتی محمد تقی عثمانی — ۶
- دینی قوتیں: پسپائی کی کوئی حد بھی ہے؟ — ۷
- پاکستان میں نفاذ اسلام: کیا، کیوں اور کیسے؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۸
-ملی مجلس شرعی کو سارے مکاتب فکر کی غیر سیاسی — ۱۰
دینی جماعت بنانے کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟

○ تعلیم و تربیت
- ہماری درسگاہوں میں 'العلم' کا فقدان — ڈاکٹر ابصار احمد — ۱۴
-تعلیم اور عالمی استعمار — سید خالد جامعی — ۲۲
- تعلیم کو استعمار کے پنجے سے نکالنے کی ضرورت — مریم سکینہ — ۲۴
- مدرسہ ڈسکورسز — مدیر — ۲۶
متجددین کی سرگرمی اور دینی مدارس کی سستی و بے حسی

○ تزکیۂ نفس
آؤ! اللہ سے دوستی کرلیں — رعایت اللہ فاروقی — ۲۷
اور پھر اس کے کرشمے دیکھیں

○ تفہیم مغرب
-مغربی تہذیب دینِ کفر اور دینِ غیر اللہ ہے (دوسری قسط) — ۳۰
مسلمانوں پر اس کا رد واجب اور اس کی پیروی حرام ہے
- مسلمانوں کو کچلنے کے امریکی منصوبے — ڈاکٹر محمد امین — ۴۱
سابق امریکی جنرل ولزلے کلارک کے انکشافات واعترافات

○ تفہیم دین
- قانون واخلاق کا باہمی ربط — صابر علی — ۴۲
- تجدد گمراہی ہے اور قابلِ رد ہے — مدیر — ۴۸
- مسلمان اور فکری پسماندگی — حافظ عمران رضا طحاوی — ۴۹

○ افغانستان
- امارتِ اسلامیہ افغانستان — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۵۱
ہیومن رائٹس، میڈیا کی آزادی اور حقوقِ نسواں کی پالیسی
- طالبان کا افغانستان — سید خالد جامعی — ۵۵
طالبان کا اصل کارنامہ- مغربی تصورات کے مطابق معاشی ترقی
- افغان طالبان کو درپیش دو بڑے چیلنج — مدیر — ۵۸
مغربی تہذیب کا رد اور عوام کی ذہن سازی
-کیا افغان نظامِ حکومت مطابقِ شریعت ہے؟ — ۶۲

○ اسلامی تحریکیں
- جماعتِ اسلامی: کل — مولانا عبدالغفار حسنؒ — ۶۴
سابق امیر جماعت کا ۱۹۹۳ء میں جماعت پر تبصرہ
- جماعت اسلامی: آج — پروفیسر ملک محمد حسین — ۶۹
جماعت کی ۸۰ سالہ جدوجہد کا تجزیہ اور کامیابی کے لیے تجاویز

○ مطالعۂ کتاب
- 'خاموش انقلاب ناگزیر ہے' — ڈاکٹر اختر حسین عزمی — ۷۵
- 'گوانتاناموبے کی کہانی، ملا ضعیف کی زبانی' — نعمان ہاشمی — ۸۱

دسمبر مشمولات

○بیاد پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم

- میرے ابا جان	ڈاکٹر طاہرہ کلثوم	۴
- اپنی کہانی کیسے کہیں؟	عبدالحسیب مجاہد	۱۱
- میرا دوست محمد حسین	سید امام شاہ	۲۳
- پروفیسر ملک محمد حسینؒ: چند یادیں	صفدر ملک امیر	۲۷
- ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے	ڈاکٹر محمد امین	۲۹
- پروفیسر ملک محمد حسینؒ: ایک معلّم، ایک قلم کار	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۳۳
- تعلیم کی اصلاح اور اسلامی تشکیل میں پروفیسر ملک محمد حسینؒ کی اَن تھک اور ناقابل فراموش مساعی	ڈاکٹر ابصار احمد	۴۱
- علم کا ایک اور آفتاب غروب ہوا	محمد یحییٰ رشید	۴۶
- آہ پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم!	ڈاکٹر انوار احمد بگوی	۵۰
- اسلامی تحریکیں اور عالمی ومقامی مقتدرہ کا جبر البرہان کے لیے ملک صاحب مرحوم کا آخری مضمون	پروفیسر ملک محمد حسینؒ	۵۴
- تعزیتی ریفرنس	مدیر	۵۹

○تعلیم و تربیت

- اصلاح تعلیم کے لیے ناگزیر اقدامات	پروفیسر ڈاکٹر اظہار الحق	۶۱
- انسانی زندگی میں استاد کی اہمیت	ڈاکٹر اللہ بخش ملک	۶۲

○اسلام اور پاکستان

- پاکستان میں نفاذ دین: کیوں اور کیسے؟	ڈاکٹر محمد امین	۶۴
-عمران خان کیوں ناکام ہوئے؟		۶۸

○تفہیم مغرب

مغربی سائنس کی ہلاکت خیزیاں	سید خالد جامعی	۶۹

○افغانستان

-لبرلز اور متجددین کی طرف سے اسلامی افغانستان کی مخالفت خورشید ندیم کے مضمون پر تبصرہ	مدیر	۷۲
- مسلم ممالک افغانستان کی حمایت کیوں نہیں کرتے؟	اوریا مقبول جان	۷۹

○تبصرۂ جرائد

ماہنامہ 'الحق' اور سہ ماہی 'البیان'	مدیر	۸۲

CPL No. 296 January 2022

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ کے زیرِ انتظام

تدریس القرآن پراجیکٹ

فری کتابیں اور فری ٹیچرز ٹریننگ

* سکولوں میں آسان انداز میں ترجمۂ قرآن سکھانے کا پروگرام
* پانچویں جماعت سے اوپر کی جماعتوں کے لیے
* اساتذہ کی گائیڈ اور طلبہ کی کتاب بلا ترجمہ الگ
* دو رنگوں میں نفیس طباعت
* لاہور کے سکولوں میں تنفیذ کی خصوصی مہم جاری ہے
* لاہور کے تقریباً ۱۰۰۰ اسکولوں میں تدریس القرآن کے ذریعے ترجمۂ قرآن سکھایا جا رہا ہے۔

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

0300-4107282 300-4354673